

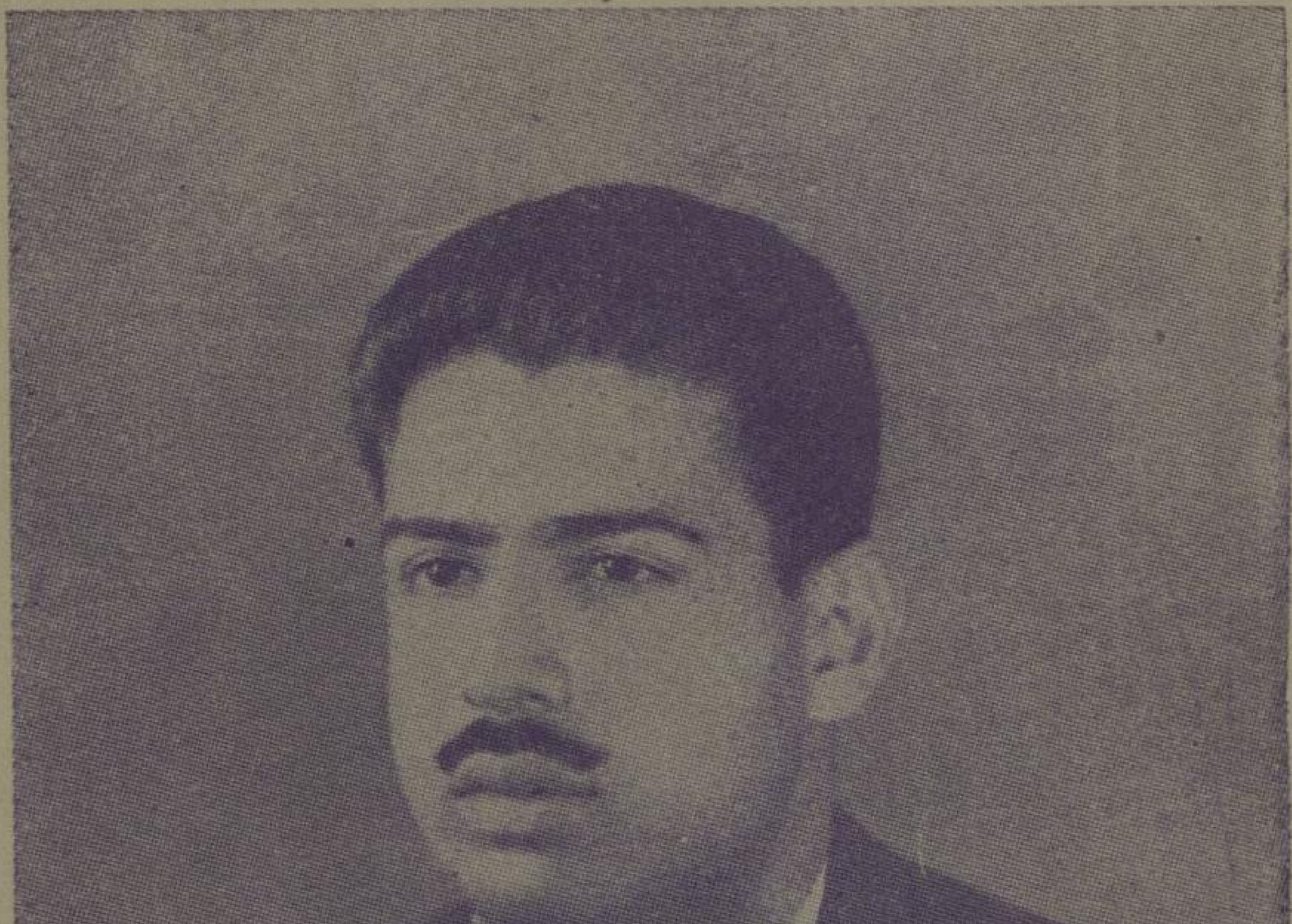

# تعمیری فکر

ریاض قمر

ابراهیم حالتوی

حاجی [illegible]

[illegible]



# تعمیری فکر

ریاض قمر

جدید ناشرین

پبلشرز۔ سٹیشنرز۔ چوک اردو بازار ——— لاہور

# فہرست مضامین

# تعارف

دنیا کا ہر شخص اس بات کا خواہشمند ہے کہ اُسے پُر سکون زندگی میسر ہو اور اس مقصد کے لئے وہ اپنی بساط کی حد تک مصروفِ کار اور سرگرداں نظر آتا ہے۔ یہ ایک ایسا نظریہ حیات ہے جو اپنے فطری تعلق کی بنا پر ہر شخص سے وابستہ ہے اس لئے ہر جسدِ انسانی کا اہم ترین جزو اور ناگزیر ضرورت ہے۔ ظاہر ہے جو چیز اس قدر اہمیت رکھتی ہو اُس کے لئے سب سے زیادہ غور و فکر، سب سے بہتر رہنمائی اور پوری قوت سے عملی قدم اٹھانا درکار ہے۔

آج دنیا میں "سائنس" کا دور دورا ہے اور ہر طرف سائنسی ترقی کے گن گائے جا رہے ہیں۔ کیوں نہ ہو مادی لحاظ سے دنیا کو جو فائدہ سائنس نے پہنچایا ہے کسی دوسری چیز نے نہیں دیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ سائنس ہے کیا چیز، اُس میں کونسی چیز شامل ہے اور کیا کچھ اس سے باہر ہے؟ یہ سوال اِس غرض کے لئے ذہن میں آتا ہے کہ دنیا سائنس کی بے پناہ ترقی کے باوجود ذہنی سکون سے خالی ہے بلکہ پہلے سے زیادہ طلبِ سکون میں پریشان ہے۔

"سائنس" کی وہ تعریف جو عالمگیر حیثیت رکھتی ہے یہ ہے کہ "سائنس اُس مرتّب و منظّم علم کا نام ہے جو انسان نے اپنے مشاہدات اور تجربات کے ذریعے حاصل کیا ہے"۔ اس تعریف کی بنا پر اگر سائنس میں صرف علم الحیات، علم کیمیا اور علم طبعیات ہی شامل کئے جائیں تو یہ نہ صرف علم کے ساتھ بلکہ انسان کے ساتھ بھی زیادتی ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا ہر وہ علم جو انسان کے مشاہدات و تجربات سے نکل کر اپنی اصلیت منوا چکا ہو وہ سائنس میں شمار ہوگا اور اُس کی اُتنی ہی اہمیت ہوگی جتنی مذکورہ بالا علوم کی سمجھی جاتی ہے۔

انسان اپنے ماحول اور معاشرے میں اسقدر جکڑا ہوتا ہے کہ اُس سے متاثر ہوئے بغیر وہ رہ نہیں سکتا۔ وہ مجبور ہے کہ جس معاشرے میں قیام رکھتا ہے اُس کو سمجھے، اس کے معاملات پر غور و خوض کرے اور لوگوں کے مشاہدات و تجربات سے فائدہ اٹھائے یا خود اپنا نقصان کرے۔ عملی زندگی میں جو مشاہدات اور تجربات سامنے آتے ہیں اور جن کے نتائج پر زمانے بھر کی شہادت کی مُہر لگ جاتی ہے وہ دراصل وہی حقائق ہوتے ہیں جو اکثر اوقات قوانین قدرت کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں۔ کیا یہ سائنس نہیں ہے؟ کیا یہ چیزیں مشاہدات تجربات کی بھٹّی سے نہیں نکلیں؟ کیا زمانہ ان فوائد و نقصانات سے آگاہ نہیں؟ بات صرف یہ ہے کہ اس "سائنس" کو لوگ سائنس نہیں سمجھتے، ورنہ اگر غور کیا جائے تو یہ سائنس آج کی سائنس سے کہیں زیادہ وسیع کہیں زیادہ آزمودہ اور کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہے۔

یہ کتاب جو آپ کے ہاتھ میں ہے اسی قسم کی "سائنس کی کتاب" ہے جو انسانی تجربات و مشاہدات کے رنگا رنگ مناظر پیش کرتی ہے۔ جس نے اول تا آخر اس کو پڑھا ہے، میرے نزدیک یہ مختلف مضامین اگرچہ عنوانات

کے لحاظ سے تو مختلف ہیں لیکن چونکہ انسانی زندگی کے متعدد اور اہم ترین پہلوؤں پر رہنمائی کرتے اور غور و خوض کی تحریک دیتے ہیں اس لئے یہ مربوط اور منظم حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کا ہر مضمون قاری کو حقیقت پسندانہ روش اختیار کرنے پر مجبور کر دے گا۔ یہ بہت بڑی بات ہے جس کی ہر پڑھے لکھے انسان کو اُتنی ہی ضرورت ہے جتنی اُسے زندہ رہنے کی۔ میں اُس ذہن کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا جس نے اپنی فکری قوتیں تعمیری راہوں پر گامزن کرنے کی قابل تحسین سعی کی ہے لہٰذا میں اپنے دوست کا تعارف بھی اگر چند حروف میں کروا دوں تو نا مناسب نہ ہو گا۔

ریاض قمر میرا ایک طویل مدت سے میرے مہربان ہیں۔ جن سے قریب ہونے اور ان کی فکری اور عملی صلاحیتوں کو پرکھنے کا مجھے بہت موقع ملا ہے۔ ان کی جواں سالی، جواں بختی اور جواں مردی تو ان کی اس تصویر سے عیاں ہے جو کتاب کے اندرونی حصہ پر جاذب نظر ہے لیکن جو چیز میرے لئے دلکشی اور دوستی کا باعث بنی وہ ان کی عادات وخصائل ہیں جو دراصل ان کی شخصیت کی صحیح آئینہ دار ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ عادات وخصائل سے ہی انسان پرکھا جاتا ہے اور عادات وخصائل کی درستی ہی انسان کی درستی ہے۔ یہی چیز اس کتاب کا لب لباب ہے جو نہایت عمدہ الفاظ و انداز میں مصنف کے مضمون "ہماری عادتیں" میں بھی پیش کیا گیا ہے۔

---

پروفیسر محمد ارشد خاں بھٹی
۲۰ دسمبر ۱۹۶۲ء

# کام - جینے کا واحد سہارا

موسم انتہائی گرم ہو یا شدید سرد - ان لوگوں پر کبھی اثر انداز نہیں ہوتا۔ جن کے دلوں میں کام کرنے کی دھن سمائی ہوتی ہے ــ میں نے گھوم پھر کر ان جنونی دھن کے نظارے دیکھے ہیں - کڑی دھوپ میں ایک معمار ـــ عمارت کی دیوار کو سیمنٹ کا "لباس" پہنا رہا ہے تا کہ یہ دیوار مضبوط ہو جائے ایک مزدور اسی دوڑ دھوپ میں ریت اور سیمنٹ کو ملا رہا ہے - اور پھر اسے ایک بڑی سی کڑاہی میں ڈال کر ـــ کڑاہی کو سر پہ اٹھائے معمار کی کی طرف بڑھ رہا ہے -

گرم لو چل رہی ہے اور ایک سبزی فروش سبزی سے بھرا ہوا ٹوکرا اٹھائے آواز لگا رہا ہے "پیاز تین آنے سیر"

دوپہر کا وقت ہے - سورج خط نصف النہار پر چمک رہا ہے - اور ڈاکیہ - ڈاک کا تھیلا اٹھائے ـــ خانہ بہ خانہ اور کوچہ بہ کوچہ ـ ڈاک تقسیم

کر رہا ہے۔

تپتی ہوا سے انگارے جھڑ رہے ہیں، اور ایک کلرک کھانا کھانے کے بعد دفتر کی طرف بھاگا جا رہا ہے۔ اس کی کھال جھلسا دینے والی ہوا سے سیاہی مائل ہو رہی ہے۔

شدید گرمی کی وجہ سے سڑک تانبے کی طرح سرخ ہو گئی ہے اور ایک پھل فروش پھلوں کی ٹوکری سر پر رکھے۔ ترازو کو ایک ہاتھ میں تھامے "بڑے گاہکوں" کی طرف بڑھ رہا ہے۔

فضا میں میدان محشر کی سی گرمی ہے اور کسان اپنے کھیتوں میں کام کر رہا ہے۔

گرمی، جلس اور گھٹن کا عالم ہے لیکن وہ لوگ جو کام کرنے کی دھن رکھتے ہیں۔ موسم کی ہر سختی سے بے نیاز ہو کر مصروف کار ہیں۔

پیاس کی شدت محسوس ہو رہی ہے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے ہیں۔ جسم جھلس گیا ہے۔ پسینہ بہہ رہا ہے۔ چہرے پر تھکن کے آثار نمودار ہیں لیکن کسان کام کر رہا ہے۔ اس لیئے کہ اسے کام کرنا ہے۔ اپنے لیئے۔ اپنے بچوں کے لیئے۔ اپنی قوم اور اپنے ملک کے لیئے۔ وہ ہر سختی سے بے نیاز ہو کر کام کیئے جا رہا ہے۔

نئے دور کے انسان نے بڑی شدت سے یہ محسوس کیا ہے۔ کہ وہ کام کیئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ حالات ایک ایسی ہوشربا حد تک بدل گئے ہیں کہ یہ صورت انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی، ایک زمانہ تھا کہ گھر کا ایک مرد کام کرتا تھا اور اس کی کمائی پر گھر کے باقی چھ افراد کی گزر اوقات ہوتی تھی، یعنی ایک آدمی سارے کنبے کے نان و نفقہ کا ذمہ دار تھا۔

اور آج گھر کے چھ افراد کام کرتے ہیں لیکن ایک فرد کو بھی زندگی کی سہولت نہیں دے سکتے۔ کجا وہ زمانہ کہ ایک فرد پورے کنبے کا کفیل تھا۔ اور کجا یہ زمانہ کہ پورا کنبہ کام کرنے کے باوجود ایک فرد کا کفیل نہیں ہو سکتا۔ ان حالات نے انسان کے دل میں کام کرنے کی دھن پیدا کر دی ہے۔ آج یہی دھن اس کے جینے کا سہارا ہے۔

میرے پاس ایک صاحب تشریف لائے۔ بیروزگاری کا گلہ کرنے لگے۔ انہوں نے فرمایا کہ انگریز کے دور حکومت میں نوکریوں کی یہ حالت نہیں تھی۔ بہت نوکریاں مل جاتی تھیں۔ جب جی چاہتا تھا۔ نوکری کرتے تھے۔ اور جب کچھ پیسے جمع ہو جاتے تھے تو نوکری چھوڑ دیتے تھے۔ نوکری چھوڑ دینے کا کوئی غم نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے کہ جب ضرورت پڑتی تھی۔ کہیں نہ کہیں نوکری مل جاتی تھی۔ اور آج۔ تو بس تو بہ ہی بھلی ہے۔

"آپ موجودہ دور سے بڑے مایوس دکھائی دیتے ہیں"! میں نے ان سے سوال کیا۔

"مایوسی تو اپنا مقدر بن گئی ہے بھائی۔۔ پورے چار ماہ گزر چکے ہیں۔۔ کئی دفتروں کے چکر لگا چکا ہوں۔۔ لیکن صاف جواب ملتا ہے۔ اگر کوئی بڑی مہربانی کرتا ہے۔ تو یہ کہہ دیتا ہے کہ یہاں ایک آدھ روزانہ چکر لگایا کرو۔ جگہ نکلی تو مل جائے گی۔۔ اب اس مہربان کو کون سمجھائے کہ صاحب اگر روزانہ یوں ہی چکر لگائے جائیں تو کھانے پینے کا بندوبست کہاں سے ہو۔ من و سلویٰ کا زمانہ نہیں۔ کہ آسمان سے خوراک اتر آئے گی۔ جب تک لہو پسینہ ایک نہ ہو گا روٹی نہیں ملے گی"۔ ان صاحب نے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہوئے ایک مختصر سی تقریر کر ڈالی۔ ان کی حالت واقعی قابل رحم تھی۔ لیکن

مجھے ان کا انداز فکر پسند نہ آیا۔ چنانچہ میں نے ان سے سوال پوچھا۔

"کیا آپ یہ سمجھتے ہیں، کہ ہماری موجودہ حکومت سے انگریزی نظام حکومت بہتر تھا؟"—

"میں تو ایسا کبھی نہ کہہ سکتا، لیکن آج کے حالات جو کچھ کہہ رہے ہیں۔ کیا آپ اس سے بے خبر ہیں — آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ زندگی کس قدر معتوب و مقہور ہو کر رہ گئی ہے۔ سکون و اطمینان کا فقدان اور مصائب و آلام کی فراوانی — آج کے دور کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ تلخ حقیقت ہے — میں نے ایسا رنگ پہلے کبھی نہ دیکھا تھا — اور ایسا رنگ پہلے تھا ہی کہاں —" انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"آپ نے شاید یہ محسوس نہیں کیا کہ پہلے اتنی آبادی تھی ہی کہاں — آج جس قدر گنجان آبادی نظر آ رہی ہے پہلے یہ عالم کہاں تھا۔ پہلے آبادی کم تھی۔ اور کام زیادہ — اب اگر کام دوگنا ہے تو اس کے مقابلہ میں آبادی دس گنا زیادہ ہے — ان حالات میں بے روزگاری کا ہونا کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے — آپ نے انگریزی دور حکومت کے چند حوالہ جات دیتے ہوئے موجودہ دور کے حقائق کو نظر انداز کر دیا۔

اگر آپ آج کے حقائق کو سامنے رکھیں تو پھر آپ انگریزی دور حکومت کا قصیدہ نہیں پڑھ سکتے۔ آپ نے ملک کی بڑھتی آبادی پر قابو پانے کی مطلق کوشش نہیں کی۔ جس کا یہ نتیجہ نکلا — کہ آبادی بڑھ گئی اور ذرائع محدود ہو کر رہ گئے۔ اس سلسلے میں اگر آپ احتیاط سے کام لیتے تو آج آپ کے لبوں پر شکایت کی تلخی نہ ہوتی۔" میں نے کہا۔

"آپ ٹھیک فرما رہے ہیں لیکن جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ بھی غلط نہیں

ہے۔ چار مہینوں سے بے کار پھرنے والے انسان کے لبوں پر اگر شکایت نہیں ہو گی تو اور کیا ہو گا" وہ بولے

"ضرور شکایت کیجئے ۔۔۔ لیکن یہ ضرور سوچیئے کہ آپ کی شکایت کی اصل نوعیت کیا ہے ۔ آپ یہ شکایت کس کے خلاف کر رہے ہیں اور کس سے کر رہے ہیں ۔ اگر آپ ان تینوں سوالوں پر غور کریں گے تو آپ کو محسوس ہو گا کہ آپ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں وہ غلط ہے"۔ میں نے کہا

"میں آپ کی منطق نہیں سمجھ سکا ۔ نہ جانے آپ مجھے کیا سمجھا رہے ہیں" انہوں نے بڑی بے زاری سے کہا۔

"میں نے جو کچھ کہا ہے اس میں کوئی منطق نہیں ہے ۔ بڑی سیدھی سی بات ہے ۔ ایک آزاد شہری کو کسی قسم کی کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ وہ خود بھی حکومت کا ایک کردار ہوتا ہے ۔ اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اس کا ذمہ دار وہ خود ہے ۔ کسی دوسرے پر اس کی ذمہ داری نہیں ڈالی جا سکتی ۔ اگر اسے کوئی شکایت ہے تو وہ اپنے آپ ہی سے ہو سکتی ہے ۔ کسی دوسرے سے نہیں ۔ وہ اپنی ہر تکلیف کے سلسلے میں آپ ہی جواب دہ ہے ۔۔۔ اگر آپ کوئی شکایت کر رہے ہیں تو یاد رکھیئے یہ شکایت آپ اپنے ہی خلاف کر رہے ہیں اور سمجھ لیجئے کہ آپ یہ شکایت بھی اپنے ہی سے کر رہے ہیں"۔ میں نے انہیں جمہوری طرز کا ایک اہم اور بنیادی نکتہ سمجھاتے ہوئے کہا ۔ وہ اس نکتہ کو سن کر اور کسی حد تک سمجھ کر خاموش ہو گئے ۔ لیکن ان کے چہرے سے یہ بات عیاں تھی کہ وہ مطمئن نہیں ہیں ۔ شاید یہ ان کی مسلسل چار ماہ کی بیکاری کا نتیجہ تھا ۔ یہ تلخ حقیقت کچھ اس شدت سے ان پر سوار تھی کہ وہ ایک دوسری حقیقت سے مطمئن

نہ ہو سکے۔

قوم کے دائرہ کار میں اس قسم کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ جہاں افراد کو معاشیات کے مرحلوں پر بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کاروبار ہو یا چھوٹی بڑی ملازمت افسری ہو یا ماتحتی ــــ ہر گوشے سے اور ہر صیغہ میں قباحتیں موجود ہیں، لیکن ان سے متاثر ہونے کی ضرورت نہیں ہے یہ دقتیں اور قباحتیں درحقیقت نئے دور کی پیداوار ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب پورے نظامِ حکومت میں کوئی تبدیلی واقع ہوتی ہے تو اس تبدیلی سے افراد کا متاثر ہونا ایک یقینی بات ہے۔ کیونکہ جب راستے بدلتے ہیں تو منزل کے تصور کو واضح کرنے کے لئے رہ نوردوں اور رہنماؤں کو خاصی تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ یہ تاریخ کا فیصلہ ہے جسے قبول کرنے والا اور نہ قبول کرنے والا دونوں یکساں طور پر متاثر ہوتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ انہیں حالات کی ناہمواری سے مایوس ہو جانا چاہیئے۔ اس قسم کی قنوطیت، ان قوموں کی ذلت آمیز ہلاکت کا باعث ہوا کرتی ہے جو اپنی تعمیری زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ پاکستانی قوم بھی اس وقت ایسے ہی حالات کے دائرہ میں ہے۔

اس بساط پر قوم کی جیت کی یہی ایک صورت ہے کہ وہ کام کی دُھن میں اپنی تعمیری تگ و دو کو جاری رکھے۔ اگر ایک افسر اپنے خنک دفتر میں بیٹھ کر مصروفِ کار ہے تو اس کا نصب العین بھی کام کی دھن کے مفہوم سے وابستہ ہونا چاہیئے اگر ایک مزدور چلچلاتی دھوپ میں کدال تھامے زمین کا سینہ چیر رہا ہے۔ تو اس کی یہ محنت و مشقت بھی کام کی دھن ہی کا اظہار کرتی ہے۔ یہی ایک ایسی صورت ہے جو قومی تعمیر و ترقی کی ضامن

ہے —
ہر چند اس وقت ہر طرف کام ہو رہا ہے کام کی دھن کے منظر زندگی کے ہر شعبہ میں نظر آ رہے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی انسان کے دل میں موجود ہے کہ مسلسل کام کے باوجود زندگی کی سہولتیں اور آسائشیں میسّر نہیں آ رہی ہیں —!

لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ جذبہ مردہ نہیں ہونا چاہیئے۔ جو کام کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کام کرنے والوں کو سہولتوں کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے، انہیں دل میں کسی قسم کی توقعات کو جگہ نہیں دینی چاہیئے۔ یہ اصولی بات ہے کہ اگر توقعات پوری نہ ہوں تو انسان کا دل مایوس ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ایسا راستہ اختیار ہی کیوں کیا جائے جو انسان کو مایوسی کے اندھیروں میں ڈبو کر رکھدے۔

کام کی دھن ہی میں قوم اور ملک کی ترقی کا راز ہے۔ بانی پاکستان حضرت قائد اعظم نے بھی کام، کام اور کام کی تلقین فرمائی تھی۔ کیونکہ انہیں اس امر کا احساس تھا کہ آزادی کی اس ابتدائی تاریخ میں گرانقدر ابواب کا اضافہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ افراد کام کرنے کی طرف توجہ دیں۔ آج کا دور بھی اسی چیز کا تقاضا کرتا ہے کہ افراد ملت زیادہ سے زیادہ کام کریں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد برلن کا عظیم الشان شہر روس کی بمباری سے تباہ و برباد ہو گیا تھا۔ آسمان کو چھونے والی عمارتیں زمین پر ڈھیر ہو چکی تھیں۔ اور ملبہ کے اس قدر انبار لگ گئے تھے جنہیں دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا۔ کہ اس ملبہ ہی کو اٹھانے کے لئے کم از کم دو سال کا عرصہ لگ جائے گا۔ لیکن ایک ہی سال کے بعد جب سیاحوں نے یہ دیکھا کہ برلن کو از سرِ نو تعمیر کیا گیا ہے اور یہ محسوس ہی

نہیں ہوتا کہ یہ شہر تباہ و برباد بھی ہوا تھا۔ تو سیاحوں کو جرمن قوم کی ہمت اور کام کرنے کی دھن پر سخت تعجب ہوا تھا۔ یہ مثال جرمن قوم نے ہی پیش کی ہے کہ اگر انسان کے دل میں کام کرنے کا مضبوط ارادہ ہو تو وہ ویرانوں کو بھی ہنستی اور مسکراتی آبادیوں میں تبدیل کر سکتا ہے۔

پاکستانی قوم کو بھی ایسے ارادے، عزم، ہمت اور مستقل تگ و دو کی ضرورت ہے۔ اور یہ بات کافی حد تک حوصلہ افزا ہے کہ پاکستان کے افراد اپنے دلوں میں کام کرنے کی بے پناہ دھن رکھتے ہیں۔ وہ موسم کی ستم ظریفیوں کے باوجود اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں، سردی، خون کو منجمد کر دینے والی سردی بھی انہیں کام کرنے سے نہیں روک سکتی۔ گرمی کے موسم کی آگ برسانے والی ہوائیں بھی ان کے جذبۂ کار کو معطل نہیں کر سکتیں، اس کا جسم ضرور جھلستا ہے لیکن اس کی ہمت اور کام کرنے کی دھن گرمی کی اس شدید حدت سے اور بھی چمک جاتی ہے۔ نکھر آتی ہے۔ کام کرنے کا یہی جذبہ ایک دن ملک اور قوم کو خوش گوار منزلوں سے ہمکنار کر دے گا۔

یہ امر اطمینان بخش ہے کہ قومی فضا میں کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کے امکانات روشن ہیں۔ جوہر قابل کی قدر کی جاتی ہے اور انسان کو یہ موقع دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ اس طریق سے قوم کے ذہن میں کچھ ایسے تصورات بھی پیدا ہو جاتے ہیں جن میں اس کے دل کا اطمینان موجود ہوتا ہے۔ اسی اطمینان کی بدولت ہر انسان کا دل مضبوط عزائم سے بھرپور ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ کام کی شکل میں ان عزائم کا اظہار کرتا ہے تو اسے خود بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے ملک کا ایک اہم فرد ہے۔ فرد کی اہمیت دولت سے نہیں ہوتی بلکہ کام سے ہوتی ہے۔ پاکستانی قوم میں کام کی دھن ایک اچھا شگون ہے۔

# ماضی پرستی - تغیرات کے آئینے میں

تغیرات پر ---- زندگی تو کیا اس ساری کائنات کا دارومدار ہے -
تغیرات سے پیدا ہونے والے نتائج خواہ کیسے بھی ہوں لیکن یہ ضرور ہے
کہ ان کی قوت سے فکروجذبہ کے گوشے متحرک رہتے ہیں - انسان
کے دامن میں کبھی شگفتہ پھول جمع ہو جاتے ہیں اور کبھی نوک دار
کانٹے اس دامن کے تاروں کو مجروح کر دیتے ہیں - دونوں صورتوں میں
زندگی کی حقیقی تحریکات کے دھارے یقیناً بہتے رہتے ہیں -- ان کی روانی
جمود، تعطل یا کسی قسم کے انحطاط کا شکار نہیں ہوتی یہ تبدیلیاں اور تغیرات
انسان کا ایک ایسا سرمایہ ہیں جو اسے زندہ رہنے کی حقیقی قوت عطا
کرتی ہیں -

ہماری زندگی کا قافلہ تین حصوں میں تقسیم ہے -- ایک حصہ تو وہ ہے
جو ماضی کی پگڈنڈیوں پر رواں دواں رہا ہے -- دوسرا حصہ زمانہ حال کی رنگینیوں

میں چلا جا رہا ہے، اور تیسرا حصہ مستقبل کی منزل سے تعلق رکھتا ہے گویا انسان اپنی زندگی کی بساط پر ماضی، حال اور مستقبل سے لاتعلق نہیں رہتا۔ اسے ماضی سے بھی پیار ہے وہ حال کا پرستار بھی ہے اور اسی طرح اسے اپنے مستقبل سے بھی بڑی امیدیں ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ماضی ــ ہر قوم کا ایک قیمتی سرمایہ ہوتا ہے۔ اس سرمایہ میں وہ موتی بھی ہوتے ہیں جن کی تابش قوم کے کمال کی مظہر ہوتی ہے اور ایسے پتھر بھی ہوتے ہیں جن کی درشتگی، کرختگی اور ناہمواری قوم کے زوال کا آئینہ ہوتا ہے، گویا یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ کہ قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں ماضی کے صحیفہ میں موجود ہوتی ہیں ۔ ماضی کے ضمن میں ایک خیال یہ بھی پایا جاتا ہے کہ حال کی تعمیر انہی تجربات کی روشنی میں صحیح انداز سے ہو سکتی ہے ۔ جن کا تعلق ماضی سے ہوتا ہے ایک قوم ماضی کے تجربات سے کسب فیض کرتی ہے ۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ زمانہ حال کی جلوہ گاہوں میں ماضی کے چراغ کو فروزاں رکھا جائے ہمیں اس حقیقت پر بڑی گہرائی تک غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ماضی، قوموں کا عظیم سرمایہ ہوتا ہے لیکن ماضی پرستی کا جذبہ ہمارے نزدیک ایک قوم کے لئے کوئی مستحسن بات نہیں ہے ۔ وقت ۔ جو ہماری زندگی کے ماہ و سال کو شمار کرتا رہتا ہے ۔ اس کی فطرت میں ازل ہی سے آگے بڑھنے کی قوت موجود ہے۔ وقت کا پرندہ جب حال کے افق پر محو پرواز ہوتا ہے ۔ تو اس کا رخ ہمیشہ مستقبل کی طرف ہوتا ہے ــ یہ پرندہ کبھی ماضی کی طرف پرواز نہیں کرتا۔ اور جب یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان وقت کے ہم رکاب اپنی زندگی

گزارتا ہے تو پھر اسے ماضی کی طرف جھانکنے کی بجائے مستقبل کی طرف نگاہ رکھنی چاہیئے، زمانہ حال کی فضا میں ایک انسان کا ماضی پرست بنے رہنا تو یقیناً ایک زوال پذیر سوچ ہے۔

زندگی کا ہر دور کچھ نہ کچھ تقاضے رکھتا ہے۔ ماضی کے دور میں زندگی جن تقاضوں کی آغوش میں تھی وہ پورے ہوتے رہے۔ انسان نے ان تقاضوں کو ہر قیمت پر پورا کیا۔ وہ دور۔ وہ انسان، وہ تقاضے، بالآخر بیت گئے۔ ماضی کے خوابوں میں روپوش ہو گئے۔ اب اُن تقاضوں اور اُن انسانوں میں "پرستش" کی کوئی بات نہیں رہی۔ صرف ماضی کی یاد باقی ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی کہ بعض لوگ اس "یاد" کی پرستش پر کیوں مصر ہیں۔ جس طرح خزاں کے دور میں بہار کے گیت یا بہار کے عہد میں خزاں کے نوحے پڑھنا دیوانگی کی ایک علامت ہے اسی طرح حال کی درسگاہوں میں ماضی کے مدفون کتابچے کھولنا بھی عقل مندی کا نشان نہیں ہے!

ہمارے آج کے دور جدید میں بھی ماضی کے نمائندے زندہ ہیں۔ پرانی وضع کے یہ بزرگ لوگ اپنے پرانے خول سے باہر نکلنا پسند نہیں کرتے، وہ زمانے کی ترقی کا حال سن کر خدا سے پناہ مانگتے ہیں۔ اور اس ترقی کو "قربِ قیامت" کا نشان کہتے ہیں۔ انسان کے ذہن کی رسائی بڑی دُور تک ہے۔ لیکن وہ اس رسائی کو ذہن کی گمراہی کا نام دیتے ہیں۔ نئی پود کے لباس کو دیکھتے ہیں تو تھر تھر کانپنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے اندازِ تعلیم کو دیکھتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ قوم کے بچے کافر ہوتے جا رہے ہیں گویا ان کے نزدیک تعلیم حاصل کرنا کفر کے مترادف ہے۔

لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں جو تشویش ان کے دل میں پیدا ہو رہی ہے اس کا تذکرہ کرنا بے کار ہے۔ دنیا تو ترقی کر رہی ہے۔ اور وہ پریشان ہیں یہ سمجھتے ہوئے کہ دنیا تباہی کی طرف گامزن ہے

قوم پر جب کوئی آفت ٹوٹتی ہے یا کوئی مشکل آپڑتی ہے تو ماضی پرست بزرگ اس آفت کو قومی کردار کا موجب ٹھہراتے ہیں۔ یہ علانیہ کہتے ہیں کہ یہ قوم ہی کی بدکرداری ہے جو اس قسم کی بلائیں اور مصیبتیں ٹوٹتی رہتی ہیں۔ اگر بیماری پھیل جائے تو اس کا ذمہ دار بھی قومی کردار ہے۔ اگر سیلاب آجائیں تو ان کی ذمہ داری بھی قومی کردار پر عائد ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ جو کچھ بھی ہوتا ہے۔ نہ تو اسے اتفاقیہ کہا جا سکتا ہے۔ اور نہ ہی قوم کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ بارشیں اگر زیادہ ہو جائیں تو قدرتی طور پر دریاؤں میں زیادہ پانی آجاتا ہے اور پھر یہ زیادہ پانی بڑھتے بڑھتے سیلاب کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اب اگر کوئی ان قدیم خیال کے لوگوں سے یہ کہے کہ حضرات یہ سیلاب تو بارشوں کی افراط کی وجہ سے تھا تو وہ کبھی تسلیم نہ کریں گے بلکہ۔ ممکن ہے وہ یہ کہہ دیں کہ اگر قوم کے کردار میں پاکبازی ہوتی تو اس قدر بارشیں نہ ہوتیں۔ اب بتلائیے بزرگوں کے اس جواز کو کون جھٹلا سکتا ہے۔

یہ بوڑھی دیواریں۔ خستہ ہونے کے باوجود نئی زندگی کے راستہ میں بری طرح حائل ہیں، یہ دیواریں۔ زندگی کی محافظ ہونے کی بجائے زندگی کی پیٹھ کا بوجھ ہیں۔ جوان ذہن۔ فکر کی بساط پہ جب کبھی کوئی تعمیری منصوبہ بناتے ہیں اور اپنی زندگی کے مسائل کو نئی روشنی میں حل کرنے کی سعی کرتے ہیں تو نوجوانوں پر ماضی پرست بزرگوں کی تنقید بڑی کڑی ہوتی ہے۔

وہ نئے ذہنوں کے نئے خیالات کی سخت مخالفت کرتے ہیں اور جب کوئی انہیں سمجھائے تو مسکرا کے کہتے ہیں "بچو! ۔ ابھی تمہیں زندگی گزارنے کا شعور نہیں آیا" وہ زندگی کے جس شعور کا رعب جماتے ہیں ۔ اب اس کے لئے تو کوئی جگہ ہی نہیں ہے، نئے زمانے میں جب پرانی زندگی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، تو شعور کا ذکر کیا معنی رکھتا ہے ۔

اگرچہ بعض حالتوں میں یہ ماضی پرست بزرگ، تعمیر و ترقی کے راستوں کا پتھر بنے ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود ان بزرگوں کو جنہیں رائیگاں نہیں سمجھا جا سکتا ۔ یہ لوگ ہماری زندگی کا ایک ضروری حصہ ہیں ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان بزرگوں کو نئی روشنی کے مفہوم سے آگاہ کیا جائے ۔ انہیں یہ بتایا جائے کہ متعدد تغیرات نے زندگی کے مزاج اور فکر و عمل پر بڑا گہرا اثر کیا ہے وہ لوگ جو ایک متحرک زندگی کا حصہ ہیں، وہ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ زندگی آج کس مقام پر ہے ۔ زندگی کے اس مقام کے قریب ماضی پرست بزرگوں کو لایا جائے ۔ ان کے ذہن میں ایک ایسا انقلاب پیدا کیا جائے کہ وہ اس امر کو تسلیم کرتے ہوئے مطلق نہ جھجکیں ۔ جس کا تعلق بدلتے ہوئے حالات سے ہے ۔ غور سے دیکھا جائے تو اس وقت ہماری ساری زندگی تبدیل ہو گئی ہے ۔ آزادی حاصل ہو جانے کے بعد ہماری زندگی کا ہر شعبہ تغیر پذیر ہوا ۔ آج سے ربع صدی پیشتر ہماری مسجدوں میں مؤذن کی اذان کوئی نصف فرلانگ کے دائرہ سے آگے نہیں بڑھتی تھی ۔ لیکن آج مسجدوں میں لاؤڈ سپیکر نصب ہو گئے ہیں، آج مؤذن کی اذان اور خطیب کی آواز ایک میل کے دائرہ میں بھی بڑی آسانی کے ساتھ سنائی دیتی ہے اور اگر رات کا پہر ہو تو یہ آواز اور بھی دور جا سکتی ہے ۔

ہماری عبادت گاہوں میں اس قسم کی تبدیلی کو ماضی پرست بزرگ بھی قبول کر چکے ہیں۔ تعجب ہے کہ وہ ان تبدیلیوں کو زندگی کے دوسرے شعبوں میں قبول کرنے سے کیوں گریز کرتے ہیں۔

ہماری درس گاہوں میں بھی تبدیلیاں آچکی ہیں۔ جن درس گاہوں میں جہاں ٹاٹ پر بچے بیٹھا کرتے تھے، اب وہاں میز اور کرسیاں نظر آتی ہیں۔ جہاں بچوں کو ایک مضمون کی صرف ایک کتاب پڑھائی جاتی تھی اب متعدد کتابوں کی تعلیم دی جا رہی ہے، پہلے بچوں کے لباس پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ لیکن اب لباس بھی سکول کے ضوابط کی حد میں آگیا ہے۔ طالب علم کو ایک خاص قسم کی یونیفارم پہننا پڑتی ہے۔ اس کے تعلیمی اوقات میں ایک خاص اہتمام کو روا رکھا گیا ہے۔ تعطیلات کے سلسلوں میں بھی ایک باقاعدگی ہے۔ طرزِ تعلیم میں بھی جدت و اصلاح کا پہلو نظر آرہا ہے۔ یہ تمام تبدیلیاں درس گاہوں میں نظر آتی ہیں۔ یہ ساری تبدیلیاں حالات ہی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ہوتی ہیں۔ لیکن زندگی کے بساط کے پٹے ہوئے مہرے نہ جانے ان تبدیلیوں سے کیوں گھبرا رہے ہیں۔

ہر چند ان تغیرات کا مقصد یہ ہے کہ بچوں کو صحیح تعلیم دی جائے اور جدید انداز کے مطابق ان کی ذہنی نشوونما کی جائے لیکن بزرگ لوگ اس طرزِ تعلیم کو انسانی کردار کا قاتل تصور کرتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں تو آج تک یہ بات سمجھ میں نہیں آسکی کہ اس طرزِ تعلیم سے انسانی کردار کیونکر قتل ہو سکتا ہے۔

ماضی پرستی کا یہ مطلب نہیں ہونا چاہیے کہ روشنی کو اندھیروں

کا نام دیا جائے ـــ اگر بزرگ لوگ نئی روشنی کی چند کرنوں کو اپنے ذہن میں رکھ کر سوچیں تو وہ یقیناً اس نئی زندگی کی بدلتی ہوئی اقدار کی ہواخواہی کریں گے۔

ہمیں ایسے لوگوں کی ذہنیت پر اظہار افسوس کرنا چاہیے، جو زمانے کی بدلتی ہوئی اقدار پر تخریبی قسم کی تنقید کرتے ہیں۔ یہ بات فہم و ادراک سے بالا ہے کہ گزرے زمانے کی کہنہ کائنات کو نئے زمانہ پر محیط کیا جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ تبدیل ہو چکا ہے۔ زبان کا اسلوب بدل چکا ہے۔ بات چیت کے تیور پہلے سے نہیں رہے۔ لباس میں بھی اب پہلی والی قطع و برید نہیں ہے۔ سبزیاں اگرچہ وہی ہیں لیکن برتن بدل چکے ہیں۔ پکانے کے ڈھنگ میں تبدیلی ہوئی ہے۔ گھروں کی ساخت میں بڑا فرق آ چکا ہے، گھروں کی تعمیر میں کئی قسم کے سسٹم رونما ہوئے ہیں۔ ساز و سامان میں تغیر آ چکا ہے۔ فرشی نشستیں، میز، کرسی اور صوفہ سیٹ میں بدل گئی ہیں ـــ لالٹین کی جگہ برقی قمقمے نظر آ رہے ہیں ـــ اب دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ دروازے کے ماتھے پر "اطلاعی گھنٹی" دکھائی دیتی ہے پہلے ایک شہر سے دوسرے شہر تک پہنچنے کے لئے مہینوں کا عرصہ درکار ہوتا تھا، اب زمین سے آسمان تک پہنچنے کے لئے دنوں کا عرصہ درکار ہے، اور کیا پتہ ہے کہ آئندہ یہ عرصہ اور بھی کم ہو جائے۔

غور سے دیکھا جائے تو اس کائنات کی ہر شئے تغیر پذیر ہوئی ہے۔ انسان اور اس سے متعلقہ ہر چیز تغیر و تبدل کا شکار ہوئی ہے۔ صنعتیں کاشتکاری آلاتِ جنگ تک میں ہمیں تبدیلیاں نظر آ رہی ہیں یہ تبدیلیاں

از خود نہیں ہوئیں بلکہ انسان نے ان کو محسوس کیا ہے اور عقل وفکر کے مطابق انہیں تشکیل کیا ہے۔ ایسی ہر تبدیلی کو قبول کر لینا ضروری ہے۔ ان تبدیلیوں کی مخالفت کرنا تو کوئی معنی نہیں رکھتا۔

پرانے خولوں میں دبے ہوئے ماضی پرست انسان جب کسی لڑکی کو سکول جاتا ہوا دیکھتے ہیں تو فوراً اپنے ہمجولیوں سے کہتے ہیں کہ۔ "زمانہ کس بے غیرتی پر اتر آیا ہے" — یہ کتنی افسوسناک ذہنیت ہے جب موجودہ دور میں تعلیم عورتوں کے لئے بھی ناگزیر ہو گئی ہے تو پھر اس کی مخالفت کرنا کتنی نادانی ہے۔

بوڑھے لوگ اپنی خواہشات کے مرجانے سے کسی حد تک دنیا سے لاتعلق ہو جاتے ہیں۔ انہیں دنیا کی یہ تبدیلیاں ایک بوجھ معلوم ہوتی ہیں، لیکن تبدیلیوں کا رونما ہونا تو ایک ضابطہ وقت ہے، زمانہ کا یہ بھی تو ایک آئین ہے کہ وہ نئی باتوں کو محض اس لئے اچھالتا ہے کہ پرانی باتیں ختم ہو جائیں — اس لئے نوجوانوں کا نئی تبدیلیوں سے متاثر ہونا ایک قدرتی بات ہے ۔ چونکہ وہ عملی زندگی کا جزو ہوتے ہیں لہذا وہ ان تبدیلیوں سے ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ بوڑھے لوگ عملی زندگی سے تو لاتعلق ہوتے ہیں۔ وہ ان تبدیلیوں کے اثرات کو محسوس بھی نہیں کر سکتے، اس لئے ہر نئی چیز کو دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں اور پکار پکار کر کہتے ہیں کہ یہ کیا زمانہ ہے یہ کیا دستور اور یہ کیا لوگ ہیں۔ جو انسانیت کو فراموش کر رہے ہیں ؟ ان کے نزدیک تو نئی تبدیلیوں کو قبول کرنا انسانیت ہی نہیں ہے۔

ہماری تعمیر و ترقی کی رفتار میں یہ ماضی پرست لوگ ایک بہت

بڑی روک ہیں - یہ نئی پود کی حوصلہ افزائی کرنے کی بجائے ان کے بدلتے افکار کو ہدف تنقید بناتے ہیں - ان کے ذہنوں پر اپنی دقیانوسی ذہنیت کا رعب جمانے کے لئے شدید قسم کی چوٹیں لگاتے ہیں - اور پھر نیا کام جس کا آغاز قوم کے نوجوان افراد کرتے ہیں - بوڑھے لوگ اپنی کبڑی کمر پر ہاتھ رکھ کر نوجوانوں کی مخالفت کے لئے کمر بستہ ہو جاتے ہیں - اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نوجوانوں کے حوصلے کمزور ہو جاتے ہیں - اور کام کو انجام دینے کی روح مرجاتی ہے -

اس وقت ہمیں اس قسم کی غلط تنقید سے دامن بچانے کی ضرورت ہے - بوڑھے لوگ جو کچھ بھی ہیں وہ ہماری زندگی کا ایک حصّہ ضرور ہیں - لیکن اس حصّہ نے معطل ہو کر کیا گیا ہے یہی ناکہ قوم جوان افراد کی روحِ تگ و دو میں رخنہ ڈالنے کی سعی کی ہے - اس روش کو بدلنے کے لئے نوجوانوں کو چاہیئے کہ وہ ان بوڑھے ماضی پرستوں کو نئی زندگی کے قریب لائیں تاکہ وہ زمانے کی بدلتی اقدار سے عملی طور پر متاثر ہوں - جب اس کائنات کی ہر شے بدل چکی ہے تو یقیناً ان ماضی پرستوں کی بوڑھی ذہنیت بھی تغیر پذیر ہو کر رہے گی -

# موسمِ سرما اور ذہنی بددیانتی

موسم مہربان ہو تو زندگی کا دامن خوشی و مسرت کے پھولوں سے بھرا ہوتا ہے۔ انسان کو ان پھولوں کی خوشبو سے ذہنی سکون اور قلبی اطمینان کی بہاریں نصیب ہوتی ہیں — اور اگر موسم ناراض ہو — تو اس کی برہمی کبھی کبھی ایک ایسی قیامت خیز صورت اختیار کر جاتی ہے جس کا تصور بے حد روح فرسا ہے — موسم کی خفگی، سیلابوں اور آندھیوں کی شکل میں کاخِ حیات کی بنیادوں کو ڈگمگا دیتی ہے۔ بہا لے جاتی ہے۔ اس خفگی کا اظہار کبھی کبھی یوں بھی نگاہوں سے گزرتا ہے۔

"لاہور، ۲ نومبر (سٹاف رپورٹر) ریلوے سٹیشن کے سامنے گراؤنڈ سے پولیس کو آج ایک اور لاوارث نعش ملی، گذشتہ ایک ہفتہ کے دوران اس علاقہ سے ملنے والی یہ تیسری نعش ہے، جس کا نام و پتہ معلوم نہیں ہو سکا اور جو بظاہر کسی گداگر کی نعش معلوم

ہوتی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ رات کی سردی کی تاب نہ لا کر اس لاغر اور ادھیڑ عمر کے شخص نے دم توڑ دیا۔ آج دوپہر پولیس نے اس کی نعش پر قبضہ کیا۔ اور پوسٹ مارٹم کے لئے میو ہسپتال پہنچا دی ۔۔۔"

اس اخباری خبر کو پڑھنے کے بعد۔ میرا دل رقّت سے بھر گیا ۔۔۔ یہ موت موسم کی خفگی کا نتیجہ تھی یا بے بسی و بے کسی کے زہر نے ایک انسان کو ہلاک کر دیا تھا۔ میرا ذہن ۔ موت کے ان دو پہلوؤں کے درمیان بہت دیر تک الجھا رہا۔ دونوں پہلو میرے ذہن کے نزدیک مساوی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن میری طبیعت کا جھکاؤ انسانی بے بسی و بے کسی کے زہر کی جانب تھا۔ ہر موسم کی خفگی تو فطرت کے ہاتھ میں ہے، لیکن اس بے بسی و بے کسی کا علاج یقیناً ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس "مرض کا علاج موجود ہے صرف توجہ کی ضرورت ہے تو کچھ غلط نہیں ۔۔۔

اس پاک سرزمین کے طول و عرض میں ہر وہ جوہر موجود ہے جو زندگی کے چار عناصر سے تعلق رکھتا ہے اور قدرت نے اس خطۂ ارض کو جو قوت عطا کی ہے اور اس کی مٹی میں جو تاثیر رکھ دی ہے اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ مجھے اس وقت بڑا تعجب ہوتا ہے جب افسردگی کی کوئی ایسی شکل نظر نہیں آئی جس میں "اکتساب" کا زیادہ تعلق ہوتا ہے یا جس میں انسانی ضمیر کی بے حسی کا عکس ہوتا ہے ۔۔۔ موسم گرما کی شدید دھوپ میں جب زندگی لُو کی تپش میں ہمیشہ کے لئے جھلس جاتی ہے ۔۔۔ موسم سرما میں کوئی مجبور انسان ٹھٹھر کر مر جاتا ہے اس وقت یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انسانیت نے آنکھیں موند لی ہیں یا آدمیت کو نیند آ گئی ہے یہ احساسات جس پہلو میں بھی ہوں

کانٹے کی طرح کھٹکتے رہتے ہیں۔

خدا نے انسان کو طاقت بھی عطا کی ہے اور حکمت و دانش بھی — وہ زخموں کا مداوا بھی کرنا جانتا ہے اور اس کے ساتھ بدقسمتی یہ ہے کہ وہ زخم لگانا بھی جانتا ہے — زندگی کی نشست گاہوں میں یہ جو کبھی کبھی فریادیں گونج اٹھتی ہیں — یہ انسان کی "فطرتِ زخم زدن" سے ہی تعلق رکھتی ہیں — ورنہ زندگی کے لئے ایسے امکانات موجود ہیں کہ وہ صدائے طرب افروز بن جائے — جہاں تک زندگی کے عوامی مفہوم کا تعلق ہے یہاں زیادہ تر نوحوں ہی کو شمار کیا جاتا ہے — لیکن اس طرف دھیان نہیں دیا جاتا کہ نوحے پیدا ہی نہ ہوں — اور زندگی کا چہرہ ہر وقت مسکراتا دکھائی دے، اسے موسم کی مہربانی راس آئے اور خنکی متاثر نہ کر سکے۔ کڑکتی دھوپ ہو یا خون منجمد کر دینے والی سردی۔ انسان ان گرم و سرد پہلوؤں کو کسی ایسے سانچے میں ڈھال دے کہ ہر پہلو انسان کا حقیقی معاون و مددگار ثابت ہو!

سردی کا موسم خالص نشو و نما کا موسم ہے۔ کام کرنے کی دُھن، کھانے پینے کا لطف اور محفل آرائی کا مزہ جس قدر موسم زمستاں کی وسعتوں میں جھلکتا ہے یہ بات کسی دوسرے موسم میں نہیں۔ قدرتی طور پر انسان نے بھی اس موسم کو ہنگامہ خیز بنا دیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ موسم سال کے اختتام سے تعلق رکھتا ہے، لہٰذا مختلف اداروں میں کئی قسم کی اختتامی تقریبات منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ طلبہ کے لئے بھی یہ موسم بڑا اہم ہے۔ امتحان کی تیاری اسی موسم میں ہوتی ہے — طلبہ راتوں کو بیٹھ کر بڑی دیر تک پڑھتے رہتے ہیں۔ اپنا مستقبل بنانے کی فکر میں وہ غلطاں رہتے ہیں۔ اخبارات اور رسائل اپنے خاص نمبر نکالتے ہیں اسی نوعیت کے بہت سے

ہنگامے زندہ ہو جاتے ہیں اور موسم سرما کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ موسم سرما۔ زندگی کو جامد و بے حس کر دیتا ہے۔ لیکن یہ مقولہ ان ملکوں پر صادق آتا ہے۔ جہاں سارا سال سردی کا دور دورہ رہتا ہے۔ سرد ملکوں کے لوگ جہاں ابھی علم و فن کی روشنی نہیں پہنچی، وہاں یقیناً سہل انگاری کی "سرد مہری" موجود ہے لیکن وہ ملک جس کی فضائیں گرمی کی تندی سے "لطف اندوز" ہوتی رہتی ہیں۔ وہاں سردی کا موسم زندگی اور زندگی کے ماحول میں ایک سرگرم تحریک پیدا کر دیتا ہے۔ ہر طرف نئے ہنگامے ابھرتے ہیں نئے خیالات پیدا ہوتے ہیں نئی سوچ بچار کا چکر چلتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ساری کائنات ایک نئے پن میں ڈھل گئی ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہوتا ہے کہ ہر نیا موسم۔ زندگی کے دامن میں تغیرات کے عناصر کو ڈال دیتا ہے۔

موسمی تغیرات جب انسان پر اثر انداز ہوتے ہیں یا یہ انسان موسمی تغیرات کے اثر کو قبول کرتا ہے۔ اس وقت عالم یہ ہوتا ہے کہ انسان کا جذبہ، احساس اور شعور ایک نئے تصوّر اور نئی تحریک کے منتظر ہوتے ہیں۔

سردی کا موسم۔ ذہن اور جسم کی نشو و نما کا موسم ہے۔ زندگی کے مختلف گوشوں میں اس نمو کی تصاویر اکثر دیکھنے میں آتی ہے۔ میں اپنے ایک دوست کا تذکرہ کرتا ہوں، جو ایک ادبی ہفت روزہ کے مدیر ہیں۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ جونہی گرمی کا موسم آتا ہے ادیب اور فنکار سست ہو جاتے ہیں۔ مضامین کی اس حد تک کساد بازاری ہوتی ہے کہ متعدد

مضامین خود لکھنے پڑتے ہیں مضامین کی فائلیں خالی پڑی ہوتی ہیں ۔ نظم، غزل، افسانہ اور مضمون و مقالہ بھی غائب ہوتے ہیں لیکن جونہی موسم سرما آتا ہے۔ فائلوں کے پیٹ بھر جاتے ہیں ۔ بلکہ مضامین نظم و نثر فائلوں کے پیمانہ سے چھلک جاتے ہیں ۔ مضامین کی بہتات ہوتی ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ ان مضامین میں کام کے جواہر پارے ذرا کم ہی ہوتے ہیں ۔ بہر کیف مواد ضرور مل جاتا ہے ۔ میرے دوست کے اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ادیب و شاعر کے ذہنوں میں سردی کے موسم ہی میں کوئی ادب پارہ تخلیق کرنے کی تحریک پیدا ہوتی ہے ۔ گویا سردی کا موسم ذہنی نمو کا باعث ہوتا ہے ۔

وہ لوگ جو کھانے پینے کے لوازمات سے کچھ زیادہ رغبت رکھتے ہیں۔ ذرا ان سے کبھی اس موسم کی خوبیاں پوچھ دیکھئے ۔ ان کے نزدیک تو یہ موسم زندگی کی عمارت کے لئے سیمنٹ کا کام دیتا ہے ۔

اس موسم میں بھوک خوب لگتی ہے ۔ مرغن غذائیں بھی قوت ہاضمہ پر اثر انداز نہیں ہوتیں ۔ بلکہ جو کچھ بھی کھایا جائے وہ جلد ہضم ہو جاتا ہے ۔ صحت بنتی ہے ۔ جسم میں طاقت پیدا ہوتی ہے اور جب طاقت پیدا ہو جائے تو کام کی رفتار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

یہ موسم ۔ انسان کی شخصیت کو بھی نمایاں کرتا ہے سردی کے ایام میں لباس کا پہلو خاص طور سے قابلِ توجہ ہے ۔ لوگ دھڑا دھڑ گرم سوٹوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ۔ کپڑے کی دکانوں پر بھیڑ لگی رہتی ہے ۔ ہر ماہ لاکھوں روپے کا کپڑا فروخت ہو جاتا ہے ۔ ذرا درزی خانوں کو بھی دیکھیں۔ دن رات کام ہو رہا ہے ۔ مشینیں چل رہی ہیں ۔ کاری گر بیٹھے ہیں کوئی

کوئلے دہکا رہا ہے۔ کوئی استری چلا رہا ہے۔ کوئی بٹن لگا رہا ہے۔ کوئی کوٹ کی آستینیں سی رہا ہے اور کوئی پتلون کو دستی بخیہ کر رہا ہے چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں چائے ڈالی جا رہی ہے۔ کاریگروں میں تقسیم ہو رہی ہے۔ روشنی کے بڑے بڑے بلب جل رہے ہیں۔ ٹیوبیں نور برسا رہی ہیں۔ اور اس روشنی کی "چھاؤں" میں کاریگروں کے چہرے مسکرا رہے ہیں۔ وہ دن کے علاوہ راتوں کو بھی کام کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ کام زیادہ ہے۔ وہ زیادہ کام کرتے ہیں۔ انہیں زیادہ مزدوری ملتی ہے۔ اس لئے ان کے چہرے خوشی سے جگمگا رہے ہیں۔

سردی کا موسم ۔ ۔ ۔ لباس کا موسم ہے۔ کاریگروں کی خوشحالی کا موسم ہے۔ کام اور انعام کا موسم ہے۔ اس موسم میں بے انتہا کپڑا فروخت ہوتا ہے۔ بے انتہا سوٹ بنتے ہیں۔ بے انتہا جسم ڈھانپے جاتے ہیں۔ لیکن؟۔ کام اور کپڑے کے اس موسم میں جب یہ خبر سنائی دیتی ہے کہ ایک انسان سردی کی تاب نہ لاکر چل بسا، تو میرے دل میں غم و اندوہ کی ایک ایسی آگ روشن ہو جاتی ہے جس کی تپش سے میری روح، میرا احساس اور میرا دل ٹھٹھر کر رہ جاتا ہے۔ لاکھوں روپیہ کا گرم کپڑا فروخت ہوتا ہے اس کپڑے کو انسان فروخت کرتے ہیں اور انسان پہنتے ہیں لیکن۔ یہ فروخت کرنے اور پہننے والے انسان کبھی اس طرف توجہ نہیں دیتے کہ ایک جسم صرف اس لئے موت کی بھٹی کا ایندھن بن گیا کہ اسے سردی سے بچاؤ کے لئے کپڑا نصیب نہ ہو سکا۔

حسین و نازنده خلعتوں کو بدن کی زینت بنانے والو
جو ہو سکے تو حیاتِ نو کا رفو طلب پیرہن بھی دیکھو

وہ ملک جہاں ہر نعمت موجود ہو، جہاں کپڑا ہو، کپڑے کے کارخانے ہوں جہاں دولت ہو اور دولت مند لوگ بس رہے ہوں - جہاں وسائل کی کوئی کمی نہ ہو، وہاں بھوک، پیاس اور عام بے بسی وبے کسی کا تصور کون برداشت کرسکتا ہے - لیکن ستم ظریفی تو یہی ہے کہ یہ سب کچھ برداشت کیا جارہا ہے - ایک انسان اسے اپنی جان کی قیمت دے کر برداشت کررہا ہے، اور دوسرا انسان اس ظلم کو اپنے تغافل اور بے حسی کے ذریعہ برداشت کرتا ہے -

ملک کے وسائل کی جانب جب کبھی میری نگاہ اٹھتی ہے تو مجھے قائدِ اعظمؒ کے الفاظ یاد آجاتے ہیں کہ قدرت نے ہمیں بے شمار وسائل دے رکھے ہیں - ان بے شمار قدرتی وسائل کا تصور جس قدر حوصلہ افزا ہے، اسی قدر عوامی حالت تنگدستی اور عسرت کی شکار ہے - یہ معاملہ نہیں ہوتا کہ آخر اس وسائل کی بھرپوری اور عوام کی زبوں حالی کا آپس میں تعلق کیا ہے - کوئی کہتا ہے کہ انسان کا دل انسانی ہمدردی اور انسانیت سے دور ہوگیا ہے -- کوئی اس امر پہ زور دیتا ہے کہ عوام کے دلوں میں حب الوطنی کے جذبہ کا فقدان ہے -- کسی کا یہ دعویٰ ہے کہ عوام کے سینوں میں ایسے چراغ روشن نہیں ہیں، جن کی روشنی میں ایک دوسرے کی ہمدردی کا سبق موجود ہے میرے نزدیک عام زندگی کی بدحالی کے یہ سارے اسباب اپنی اپنی جگہ درست ہیں اور وزن رکھتے ہیں لیکن سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ملت کے افراد درحقیقت دینی دیانت سے محروم ہوگئے ہیں -

مذہب جو نہ صرف روحانی تعمیر کرتا ہے بلکہ زندگی گزارنے کا صحیح

طریقہ بتلاتا ہے عوام اور خواص اسے نظر انداز کرتے جا رہے ہیں۔

مذہب سے دوری کا مطلب روحانیت کا فقدان ہے اور یہی فقدان انسان کو ذہنی دیانت کے جوہر سے محروم کر دیتا ہے انسان کے ہر عمل میں اس کی سوچ اور عقل کا تعلق ہے۔ اور جب سوچ اور عقل۔ ناصاف اور مبہم ہوں تو پھر کس طرح عمل کا پہلو نکھر سکتا ہے۔ عمل کا پہلو تو ذہنی دیانت ہی سے نکھرتا ہے۔

ذہنی دیانت کی موت کا ایک واقعہ ملاحظہ کریں۔ کچھ دنوں کی بات ہے میں ایک دوست کے ہاں بیٹھا ہوا تھا، ہم دونوں گپ شپ میں مصروف تھے۔ اسی اثنا میں اس کے دفتر کا چپڑاسی آیا اور اس نے کہا کہ حضور میرے دو بچوں کو تین یوم سے بخار آ رہا ہے۔ اگر میری تنخواہ میں سے آپ دس روپے پیشگی دے دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ میرے دوست نے افسرانہ لہجہ میں کہا۔ پیشگی رقم کی کوئی درخواست قبول نہیں کی جا سکتی، ہم سختی سے پیشگی دینا بند کر چکے ہیں۔ چپڑاسی بے چارے کی کیا مجال تھی کہ دوبارہ سوال کرتا، بڑی مایوسی کے عالم میں کمرے سے باہر نکل گیا، اس کے بچے بیمار تھے اور مالک نے اسے دس روپے نہیں دیئے کہ وہ دوا خرید سکتا۔ "آپ کو دس روپے دے دینے تھے؟" میں نے اپنے دوست سے کہا اور اس کا جواب یہ تھا کہ "بھئی اس طرح ان لوگوں کا مزاج خراب ہو جاتا ہے"

میں اس معما کو نہ سمجھ سکا کہ ایک نوکر کی ضرورت پورا کرنے سے اس کا مزاج خراب ہو جائے گا۔ یا وہ پہلے سے زیادہ سُدھر جائے اور اپنے مالک کا زیادہ سے زیادہ وفادار بن جائے گا۔ میں ابھی اس سوچ ہی

میں تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اس نے ٹیلیفون اٹھایا ٹیلیفون اس کی بیگم کی طرف سے تھا۔ جس نے پک نک پر جانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ بیگم نے اس پروگرام کے لئے پچاس روپے مانگے تھے۔ نوکر روپیہ لینے کے لئے گھر سے چل پڑا تھا۔ "بھئی ان عورتوں کو اگر روپیہ نہ دو، تو ان کا موڈ خراب ہو جاتا ہے" اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ میں نے دوست سے اس موضوع پر بحث کرنا پسند نہیں کی، چپڑاسی کو دس روپے بچوں کی دوا کے لئے دینے سے چپڑاسی کا مزاج خراب ہو سکتا ہے اور بیگم کو اگر پچاس روپے نہ دیئے جائیں تو اس کا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔ اس مزاج اور موڈ کے پس منظر میں پست ذہنیت آشکارا ہے یہی ذہنی پستی دراصل ذہنی دیانت کے نہ ہونے کا ایک سبب ہے۔ اگر قوم کے پاس بے انتہا روپے ہوں، بڑی قوت وطاقت ہو، بڑا زر ومال اور دولت ہو لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود اگر قوم کے افراد ذہنی دیانت نہیں رکھتے تو یہ قوم کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے۔ اس وقت حالت یہی ہے کہ ملک کے ہر وسیلہ سے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ابھی تک عوام کی حالت حسب دستور ہے۔

وہ لوگ معاشرتی سطح پر بہت زیادہ پست ہیں اور خاص توجہ کے مستحق ہیں۔ کسی موسم میں تو یہ تاثیر نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں خلوص کی روشنی بھر دے یا ان کے ذہنوں میں فکری دیانت کے پھول کھلا دے یہ تو صرف احساس وشعور کی قوت ہی پیدا کر سکتی ہے اگر انسان اس قوت کو اپنے دیدہ ودل میں پیدا کر لے۔ موسم سرما میں نشوونما کی بڑی قوت ہے لیکن وہ ذہنی تبدیلی پیدا کرنے سے معذور ہے۔

وہ زندگی جو اس موسم میں ہر قسم کی لطافتوں اور آسائشوں سے مستفید ہوتی ہے مجھے اس زندگی سے صرف اتنا کہنا ہے کہ اس خطہ ارض پر ایک ایسی زندگی بھی ہے جو نشوونما کے اس موسم سے اس لئے خوف کھاتی ہے کہ یہ موسم اس زندگی سے فطری نشوونما کی ساری قوتیں چھین لیتا ہے۔ یہ زندگی آج بھی بے حسی کے خشک زمین پر بے بسی کے کالے آسمان تلے، موسم کی ستمرانیوں سے پناہ مانگ رہی ہے۔ آسائش و لطافت میں ڈوبی ہوئی زندگی کے لئے کیا یہ ضروری نہیں کہ وہ دوسری مظلوم زندگی کی حفاظت کرے۔ نیک نفسی سے ہمدردی کا ہاتھ تو بڑھائے۔ اس مظلوم زندگی کے دائرہ میں بجھے بجھے چہرے بھی روشن ہونے کی تمنا رکھتے ہیں۔ لیکن بے روغن چراغ کیونکر روشن ہو سکتا ہے ان بجھے چہروں کے لئے بھی روغن ہی کی ضرورت ہے۔ ایسا روغن جو ان کے لئے سامانِ حیات فراہم کر دے، جینے کی تمنا تو یہ لوگ بھی رکھتے ہیں لیکن جینے کے آثار ان کے لئے کون پیدا کرے۔ نہ جانے ان لوگوں کے دلوں پر کیا بیتتی ہوگی جب یہ نشوونما کے موسم میں بھی زندگی کے آثار کو مفقود و معدوم محسوس کرتے ہوں گے۔

خدا جانے نشوونما کا وہ حقیقی موسم کب آئے گا جب خزاں زدہ زمین سے بھی بہار کے مشک بار پھول کھلیں گے۔ دیکھئے۔ ابن آدم کو کب تک انتظار کرنا پڑتا ہے ؛

# فنکار - ایک جنگل کا پھول

اگر مجھ سے کوئی یہ سوال پوچھے کہ حیاتِ جاوداں کس چیز کا نام ہے. تو میرا جواب ہوگا "کمال فن" میرے نزدیک کمال فن کے ان دو لفظوں میں حیاتِ جاوداں کا ہر راز پوشیدہ ہے۔ فن کار کا تعلق چونکہ مادی عناصر سے ہوتا ہے اس لئے فن کار موت کی آغوش میں جا اترتا ہے۔ لیکن فن؟ — فن کبھی نہیں مرتا اس لئے کہ اس کا تعلق مادی عناصر سے نہیں ہوتا — آفاقی عناصر فن میں مضمر ہوتے ہیں — اور یہی فن کو زندہ جاوید رکھتے ہیں۔

ہر زمانے میں فنکاروں نے فن کو بامِ ارتقا پر لانے کی کامیاب مساعی کی ہیں۔ دن رات کی تحقیق و تجسس اور ذہنی کاوشوں کے ذریعہ انہوں نے اپنے اپنے فن کو عرصہ کمال میں رواں دواں رکھا ہے — وہ فن کار آج اس دنیا میں نہیں ہیں۔ لیکن ان کے فن کے کمالات اس کائنات

کا عظیم ترین سرمایہ بن چکے ہیں اور انہی فنون کی بدولت ان کے نام زندہ ہیں۔ طب کے لفظ کے ساتھ بوعلی سینا کا نام زندہ ہے ۔ فلسفہ و منطق کا تذکرہ کرتے ہوئے بقراط و سقراط اور لقمان کی یاد ضرور تازہ ہو جاتی ہے ۔ یہی صورت دوسرے فنون اور ان سے تعلق رکھنے والے فن کاروں کی ہے ۔ گویا قدیم فنون اور قدیم فن کار آج بھی ایک دوسرے کا زندہ تعارف ہیں۔

نئے دور میں فن کا مقام کیا ہے ۔ کہاں ہے اور کیسا ہے۔ اکثر اوقات میں ان تین پہلوؤں کے ایک سوال پر غور و فکر کرتا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ میں یہ سوچتا ہوں کہ فن کار کی حیثیت کیا ہے۔ اور اسے کیا ہونا چاہیئے ۔ ان دو سوالوں کا جواب ڈھونڈنا میرے لیئے جتنا آسان ہے ۔ اتنا ہی مشکل بھی ہے ۔ آسان اس لئے ہے کہ نئے دور کے فنکاروں کی حالت مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ گویا میں یہ جانتا ہوں کہ آج کے دور کا فن کار زبوں حال ہے ۔ لیکن اسے ایسا نہیں ہونا چاہیئے اس کا سراغ لگانا میرے لیئے دشوار ہے۔

اس دشواری کو آسان کرنے کے لئے جب میں فن کے مقام کو ڈھونڈتا ہوں تو میرا ذہن کچھ مزید الجھ جاتا ہے ۔ سمجھ نہیں آتا کہ اسے زمانے کی ناقدری کہوں، بدلتے حالات کو مجرم ٹھہراؤں یا میں یہ فرض کر لوں کہ فن کار سہل انگار ہو گیا ہے ۔ اگرچہ یہ تینوں وجوہ اپنی اپنی جگہ بجا ہی معلوم ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود دل کو اطمینان حاصل نہیں ہوتا ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض ایسے تلخ حقائق کا سامنا ہوتا رہتا ہے جو فن کے مقام سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کا تصور بھی ذہن

کو پریشان کر دیتا ہے۔

ایک بار ایک دوست سے فن کے موضوع پر بات چیت ہوئی وہ صاحب فن کے ارتقا کا ایک یہ ثبوت پیش کر رہے تھے کہ گھوڑا بھی رقص کرتا ہے۔ وہ باجے کی آواز پر باقاعدہ "پاؤں" اٹھاتا ہے اور کسی ماہر رقاص کی طرح ناچتا ہے۔ میں بڑی خاموشی کے ساتھ ان کی گفتگو کو سنتا رہا۔ اور آخر جب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا تو میں نے اپنے اس دوست کو مخاطب کر کے کہا:

"میرے عزیز دوست! تم نے گھوڑے کے رقص کو فن رقص کا ارتقا کہا ہے۔ لیکن یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ گھوڑے کا رقص فن کا ارتقا ہے یا فن سے ایک سنگین قسم کا مذاق ہے؟"

"میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔ گھوڑا رقص کرتا ہے تو اس میں فن سے مذاق کا کونسا پہلو پوشیدہ ہے؟" میرا دوست بولا۔ مجھے اپنے اس دانا دوست کی سادگی پر ہنسی آ گئی۔ اس نے فن کے مقام کو گھوڑے کی پشت پر سوار کر کے فن ناشناسی کا کتنا بے رحم ثبوت مہیا کیا تھا۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا:

"میرے بھائی۔ تم نے گھوڑے کو رقص کرتے دیکھا اور فن کی "بلوغت" کے قائل ہو گئے۔ لیکن نگاہ اس فن کار پر نہیں پڑی جس نے کئی مہینوں کی مشق سے گھوڑے کو رقاص بنایا ہے۔ تم نے یہ اندازہ تو نہیں لگایا ہو گا کہ گھوڑے کی ناز برداری کا بوجھ فن کار نے کس طرح اٹھایا ہو گا۔ تم نے فن کار کے ہاتھوں کو تو نہیں دیکھا ہو گا۔ جن کی کھال گھوڑے کی مالش کرتے کرتے گھس گئی ہو گی۔ شاید تم نے یہ بھی نہیں سوچا ہو گا

کہ گھوڑے کو صبح و شام دودھ میں بھگو کر دانہ دیا جاتا ہوگا جب کہ فن کار کے بچے دودھ کی بوند کو ترستے ہوں گے ۔ تمہارے ذہن میں یہ بات بھی نہیں آئی ہوگی کہ موٹا تازہ گھوڑا فن کار کے مریل جسم پر ایک چابک بن کر برس گیا ہوگا تم نے تو صرف گھوڑے کا ناچ دیکھا اور فن کے ارتقا کے قائل ہو گئے ۔ جس ملک کے گھوڑے فن کار پر سوار ہو جائیں ۔ کیا اس ملک کو خوش قسمت یا ترقی یافتہ کہا جاتا ہے ۔ کاش گھوڑے کے فن کو داد دینے والے فن کار کی بھی حوصلہ افزائی کر سکتے ۔ یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے "۔

"آپ تو فن کی باریکیوں میں کھو گئے ہیں ۔ فن اور فن کار میں یہی رشتہ ہے جو چاند اور چاندنی میں ۔ پھول اور خوشبو میں "۔ میرے دوست نے کہا۔

"میرا جی چاہتا ہے کہ پھر ایک بار تمہاری سادہ لوحی پر ہنسوں "۔ میں نے کہا ۔ "بڑے شوق سے ہنس لیجئے ۔ لیکن یقین رکھیئے میں نے کوئی غیر معقول بات نہیں کہی ۔ فن کا ارتقا ۔ فن کار کا بھی ارتقا ہے "۔ وہ بولا۔

"مجھے افسوس ہے کہ تم حقائق سے چشم پوشی کر رہے ہو ۔ فن کے ارتقا والی بات تو خیر ایک حد تک درست ہے ۔ لیکن فن کار کے ارتقا کا تصوّر بھی غلط ہے ۔ نہ جانے تم کون سے فن کی بات کہہ رہے ہو اور کون سے فن کار تمہاری نگاہ میں ہیں ۔ میں نے اس نئے دور میں تو فن کار کو تباہی و بدحالی کا شکار دیکھا ہے ۔ اور فن ؟ ۔ اس نے تو اپنا مقام ہی بدل ڈالا ہے ۔ اب ایک کتا کھیل تماشے کے فن کا مظاہرہ

کرتا ہے اور چاندی کے کپ بطور انعام اس کی نذر کیئے جاتے ہیں۔ ایک ادیب اپنے خونِ جگر سے ایک کتاب لکھتا اور اسے اس کتاب کا معاوضہ اس قدر بھی نہیں ملتا کہ وہ اپنے فاقوں کو ٹال سکے۔ ایک کتا سو گز کی بلندی سے چھلانگ لگاتا ہے۔ تو اس پر سونے اور چاندی کے سکے نچھاور کیئے جاتے ہیں۔ ایک فن کار کے لہو کی بوند پانی کے قطرے سے بھی ارزاں ہے ایک مطرب کا یہ حال ہے کہ بسا اوقات اُسے نغموں کے ساتھ ساز کو بھی فروخت کرنا پڑتا ہے ۔۔۔!

مجھے تو اس دور کی ذہنیت کو دیکھ کر سخت کوفت ہوتی ہے۔ اس ملک میں جانوروں کی تو قدر و منزلت کی جاتی ہے۔ لیکن انسانوں کو شاید اس کا اہل ہی نہیں گردانا جاتا ۔۔۔!

یہ زمانہ ایک سچے فن کار کو جس طرح کچل رہا ہے بلکہ اس کی ذلت اور اہانت کے اسباب پیدا کر رہا ہے۔ تاریخ عالم میں کہیں اس کی مثال نہیں ملتی"۔ میں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں ۔۔ لیکن اس بات میں کیا حرج ہے اگر جانور بھی اپنے فن کا مظاہرہ کریں ۔۔ یہ مظاہرہ تو اس بات کا نشان ہے کہ ملک ترقی کی راہوں میں گامزن ہے"۔ اس نے بڑی متانت کے ساتھ کہا۔

"میرے دوست جو کچھ میں نے کہا ہے۔ ابھی تک تم اسے سمجھ نہیں سکے۔ گھوڑوں کا یہ رقص، کتوں کی دوڑوں اور بیلوں کی چھلانگیں یہ سب فنی مظاہرے ہی سہی لیکن جس بدحالی کا مظاہرہ آج فنکار کی زندگی کر رہی ہے اس پر بھی تو ایک نظر ڈالو۔ کیا تم نے کبھی یہ سوچا بھی ہے

کہ تمہارا فن کار زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم ہے - اس کے پاس رہنے کے لیئے کوئی معقول جگہ نہیں ہے اس کے پاس اتنا روپیہ نہیں ہے کہ وہ بھی زندگی کی آزاد محفلوں میں شریک ہو سکے - اس کے پاس کسی کار یا کوٹھی کا "ملکیت نامہ" بھی نہیں ہے - اس کی جیب میں روپیہ کہاں صرف ایک قلم ہے - اور قلم بھی ایسا جس کی سیاہی سوکھ چکی ہے - یا جس کی نب شکستہ ہے -

تمہارا یہ دور کتّوں کو تو دوڑا سکتا ہے لیکن ایک عظیم فن کار کے پاؤں میں اتنی سکت بھی نہیں رہنے دیتا کہ وہ صرف چل ہی سکے --

یاد رکھو جس قوم میں اس قسم کے رجحانات پیدا ہو جاتے ہیں کہ وہ شاہین کو بھی کرگس کی حیثیت سے دیکھے وہ قوم ایک دن قعرِ مذلت میں گر جاتی ہے - اور اس بری طرح کہ پھر عمر بھر ابھرنا محال ہو جاتا ہے - انسان اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے - اور اس کا یہ مظاہرہ "سکوت سخن شناس" کے دائرہ میں دم توڑ دیتا ہے - اور جانور اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے تو "تحسینِ ناشناس" کے ہزار پہلو اجاگر ہو جاتے ہیں - وہ لوگ جو انسانوں کو نظر انداز کر کے جانوروں کے فنی مظاہروں پر داد کے ڈونگرے برساتے ہیں - میں تو انہیں تحسینِ ناشناس ہی سے تعبیر کروں گا"

"آپ کی ان تمام باتوں کا مطلب یہ ہے کہ فن اپنے مقام سے گر چکا ہے - یا اپنا مقام بدل چکا ہے اس لیئے سچے فنکاروں کی زندگی پر ایک عذاب طاری ہو چکا ہے" - میرے دوست نے کہا -

"ہاں - بالکل یہی بات ہے - اب تم بات کی تہ تک پہنچ چکے ہو -

میرے کہنے کا مقصد تو یہی ہے کہ فن اپنی جگہ چھوڑ گیا ہے اور فن کار اپنے مقام سے گر گیا ہے۔" میں نے جواب دیا ــــ!

"تو پھر اس کے لئے کیا کرنا چاہیئے؟" میرے دوست نے دریافت کیا۔

"اس موضوع پہ پوری قوم کو غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے۔" میں نے جواباً کہا ــــ

"لیکن پوری قوم کو اس مسئلہ سے کیا غرض؟" اس نے پوچھا۔

"فن کار کا تعلق پوری زندگی سے ہوتا ہے وہ پوری قوم کے لئے سوچتا ہے۔ اس لئے قوم کے ہر فرد کو اس کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔" میں نے کہا۔

"کیا یہ ضروری نہیں کہ خود فن کار بھی اپنی طرف متوجہ ہو۔ تو اس کی زبوں حالی کا مسئلہ پوری قوم کا مسئلہ نہ بن سکے۔" میرا دوست بولا۔

"یہ ناممکن ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کیوں؟" ــــ میرے دوست نے سوال کیا۔

"تمہارے اس ایک لفظ "کیوں" کا جواب اگر تفصیل سے دیا جائے تو اس کے لئے پوری کتاب کی ضرورت ہے۔ مجھے فن کار کی سرشت کا تجزیہ کرنا پڑے گا۔ مجھے اس کے دنیاوی رشتوں کو زیر بحث لانا ہوگا۔ مجھے یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اس کے چلن اور ماحول کے چلن میں کتنا فرق ہے۔ اور کتنی مطابقت اور اس فرق اور مطابقت کے جملہ اسباب کیا ہیں۔ مجھے اس کی ذمہ داریوں اور عوام کی حوصلہ افزائیوں کا بھی ایک دیانتدارانہ موازنہ کرنا ہوگا۔ جب کہیں میں تمہارے اس ایک لفظ

"کیوں" کا جواب دے سکوں گا۔ سر دست میں تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ایک فن کار کی زندگی اس کے اپنے لئے نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی زندگی قوم کے لئے ہوتی ہے جس طرح ایک ڈاکٹر کی زندگی میں دوسروں کا حصہ زیادہ ہوتا ہے اور اس کا اپنا حصہ بہت ہی کم اسی طرح ایک فن کار کی زندگی بھی دوسروں ہی کے لئے وقف ہوتی ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو فنکار بھی انسانی ذہن کا ایک معالج ہے جب فن کار کے منصب نے اسے اپنی زندگی پر کوئی حق ہی نہیں دیا تو پھر اسے اپنی زندگی کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہی کیا ہے قوم کو اس کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے"۔ میں نے جواب دیا۔

"تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ قوم کی عدم توجہی فن کار کی زبوں حالی کا باعث ہے"۔ وہ بولا۔

"بالکل ٹھیک کہا تم نے ــــ قوم کی عدم توجہی بلکہ تغافل ہی اس زبوں حالی کا ذمہ دار ہے۔ اور یہ بھی ایک قسم کا قومی تغافل ہی تو ہے کہ انسان کو نظر انداز کر کے جانوروں کو فن کے پنجرہ میں ڈالا جا رہا ہے۔ اور اس تغافل کا سب سے بڑا ثبوت تم ہو"۔ میں نے اپنے دوست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ کیسے"؟ ــــ میرے دوست نے حیرت زدہ ہو کر سوال کیا۔

"تمہیں نے تو کہا تھا کہ گھوڑے کا ناچ فن کا ارتقا ہے۔ کاش تم یہ کہتے کہ گھوڑے کا ناچ قومی تغافل کا ایک زہریلا نشان ہے"۔ میں نے کہا۔

"مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے۔ واقعی جس قوم کا رجحان جانوروں کی

طرف ہو اس کا تو خدا ہی حافظ ہے"۔ وہ بولا

"تم یہ کیوں کہتے ہو کہ قوم کا رجحان جانوروں کی طرف ہے۔ تمہیں تو یہ کہنا چاہیئے کہ قوم کا رجحان جانوروں جیسا ہے"۔ میں نے کہا۔

"بلکہ اس سے بھی بدتر"۔ میرا دوست بولا۔

"بالکل ٹھیک۔ انسانوں کو نظر انداز کر دینے کا رجحان تو جانوروں کے رجحان سے بھی بدتر ہے میرا خیال ہے جانور بھی اپنے ہم جنسوں کے بارے میں انسانوں جیسی غیر معقول روش اختیار نہیں کرتے ہوں گے"۔ میں نے کہا۔

"سوال یہ ہے کہ اس مرض کو کیونکر دور کیا جا سکتا ہے۔ فن کار تو اپنے اس "ذاتی موضوع" پر سوچنے سے رہا۔ اب یہ قوم کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس پر نظر التفات کرے ورنہ قوم کے اس قیمتی جوہر کے برباد ہو جانے کا اندیشہ ہے"۔ میرے دوست نے فنکاروں سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے اس موضوع پر غور کرنے کو قومی ذمہ داری قرار دیا ہے یہ درست ہے لیکن سب سے پہلے تو قوم کو اس ذمہ داری کا احساس دلانے کی ضرورت ہے"۔ میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے۔ قوم کو اس ذمہ داری کا احساس ضرور ہے"۔ وہ بولا۔

"تم بالکل غلط کہتے ہو۔ اگر اس ذمہ داری کا احساس ہوتا تو نہ فن پامال ہوتا۔ نہ فن کار کو گردشِ حالات کا شاکی ہونا پڑتا۔ نہ تخلیق کی رفتار رکتی اور نہ زندگی پر جمود طاری ہوتا۔ میرے نزدیک قومی تغافل سے زیادہ

قومی احساس قابلِ محاسبہ ہے۔ قومی احساس فنکار کی طرف اس قدر سرد ہے جیسے برف کا کوئی ٹکڑا۔

میرے دوست اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ سب سے پہلے قوم کو یہ احساس دلایا جائے کہ فن کار کی طرف متوجہ ہونا بھی اس کی ایک قومی ذمہ داری ہے"۔ میں نے اپنے دوست کے خیال کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی ۔ اب اس پر "تحسین ناشناس" کا رنگ نہیں تھا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ جیسے فن کی موت پر وہ ایک سوگوار کا روپ دھار چکا ہے یا فن کار کی میت اس کے کندھوں پر رکھ دی گئی ہو۔

# عورت

عورت قدرت کا ایک عظیم ترین شاہکار ہے۔ نسلِ انسانی کی بقا کا راز عورت ہی کے وجود میں پوشیدہ ہے وہ اس کائنات کا حسن ہے یا یہ کائنات اسی کے حسن کا پرتو ہے۔ اگر ہم زندگی کو چند مقدس رشتوں کا مجموعہ سمجھ لیں۔ تو ان تمام رشتوں کا سنگم عورت ہی کی ذات ہے۔ قدیم روایتی زبان میں عورت کو صنفِ نازک کہا جاتا ہے۔ معلوم نہیں یہ اعزازی لقب اسے کس نے عطا فرمایا اور کب ؟ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مردوں کی بالا دستی کا جذبہ کارفرما ہے۔ مردوں نے اپنے اس بھرم کو قائم رکھنے کے لئے نہ صرف عورت کو صنفت نازک کہا۔ بلکہ اسے صنفِ نازک بنا دیا ہے۔ حالانکہ دنیا کی مختلف تاریخوں میں عورت نے اپنے اس خطاب کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی تھیں۔ قرطبہ کی تاریخ میں ہسٹر روبال کی بیوی نے اپنے شوہر سے وطن کا غدار بن جانے کی صورت میں جو انتقام لیا تھا۔ وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ عورت کا دل پتھر کے ٹکڑے میں بھی ڈھل

سکتا ہے ـــ

ہسدڑوبال کی بیوی بھی ایک عورت تھی وہ بھی صنفِ نازک ہی کہلاتی تھی ۔ لیکن اس صنف نازک نے اپنے بچوں کو اپنے شوہر کے سامنے دہکتی آگ میں پھینک دیا تھا ۔ ایک عورت کا اتنا حوصلہ اور اتنا کلیجہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو زندہ آگ میں ڈال دے ۔

تاریخ عالم کے اوراق میں ایسی بے شمار عورتیں ہیں جو اپنی بے مثال بہادری و جرأت کے سبب آج بھی قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں ۔ ایسی عورتیں جون آف آرک کے روپ میں ہوں یا سلطانہ چاند بی بی کی شکل میں ـــ اس امر کی شہادت بہم پہنچانے کے لئے کافی ہیں کہ عورت صنف نازک نہیں بلکہ اس حد تک جی دار بھی ہے کہ اس کی جیداری کا مقابلہ بڑے بڑے سورما بھی نہیں کر سکتے ـــ پھول کی یہ پتی جب مشتعل ہوئی ہے تو اس پتی نے تلواروں کے منہ کند کر دیئے ہیں ـــ جب یہ نازک سی کلی انتقام لینے پر تُل گئی ہے تو اُس نے شعلہ جوالا بن کر بڑی طاقتوں کے خرمن جلا کر راکھ کر دیئے ہیں جسمانی قوتوں کے مظاہرہ کے علاوہ جب وہ عدل وانصاف کی مسند پر بیٹھی ہے تو دنیا نے اس کی ذہانت اور سوجھ بوجھ کا اعتراف کیا ہے ۔ وہ محبت کے خارزاروں میں قدمزن ہوئی ہے تو اس نے اپنے لہو سے بہار افروز کارناموں کو تخلیق کر کے دکھا دیا ہے ۔ اس نے دنیا کی عظیم ترین مہموں کو سر کیا ہے اور ساری دنیا اس کی بہادری کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئی ہے ۔

اس نے قدم قدم پر یہ ثابت کیا ہے کہ عورت کو صنف نازک کہہ دینا اس کی ذات پر ایک بدترین قسم کا الزام ہے زمانے کے ساتھ یہ الزام اتنا

پختہ ہو گیا تھا کہ عورت یہی سمجھ بیٹھی تھی۔ جیسے وہ عورت بعد میں ہے اور صنفِ نازک پہلے۔

قریباً ہر دور میں عورت کو مظلومیت کا شکار رہنا پڑا۔ اور یہ سب کچھ مردوں کی خود غرضانہ سوچ کا نتیجہ ہے۔ وہ اس قدر خود نگر ثابت ہوئے ہیں کہ انہوں نے کبھی اور اس امر کی توجہ بھی نہیں دی۔ کہ عورت نام کی بھی اس کائنات میں کوئی چیز ہے۔ اور جب کبھی انہیں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ واقعی عورت اس کائنات کی بنیاد ہے تو وہ عورت کی برتری کی عظمت کو تسلیم کرنے سے گریز کرتے رہے۔ مردوں کی یہ خود پسندی، خود نگری اور خود غرضی ہے۔ درحقیقت عورت کی مظلومیت اس کی پس ماندگی کا باعث بنی۔ وہ ظلم جو صدیوں سے عورت پر روا رکھا گیا۔ عورت کی زندگی کا ایک جزو بن کر رہ گیا۔ اب تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مظلومیت کے عنصر کو اگر عورت سے خارج کر دیا جائے تو وہ ایک ادھوری عورت رہ جاتی ہے۔ عورت کی یہ تشریح کس قدر افسوسناک ہے۔

عورت کی عظمت کا اندازہ لگانا ایک دشوار بات ہے آجتک عورت کے بلند مقام کا اندازہ ہی نہیں لگایا گیا۔ اور یہ اندازہ لگایا بھی کیونکر جاتا۔ جب کہ یہ کام بھی مردوں ہی کے ہاتھ میں تھا۔ اس اندازہ سے مرد کو یہ گمان ہوتا تھا کہ اس کی انا کو شکست مل جائے گی۔ مرد اپنے پندار کی شکست قبول کرنے کے لئے کبھی بھی تیار نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ عورت کو "پاؤں کی جوتی" جیسی حقیر استاریت کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے اور ہمارے ملک میں تو خاص کر فندرونر لت کی یہ تجلی ابھی تک ذلت و پستی کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی ہے وہ جب کبھی اندھیروں کے اس سمندر سے

ہاتھ پاؤں مار کر باہر نکلنے کی کوشش کرتی ہے۔ تو مرد اسے اپنی برتری کے سنگینوں میں بٹھا لیتے ہیں اور کسی ایسے بھنور کے چکر میں ڈال دیتے ہیں۔ جہاں وہ برسوں غوطے کھاتی رہتی ہے۔ ہمارے ملک کے مردوں کی بیشتر تعداد ابھی تک عورت کو اپنے مظالم کا نشانہ بنائے ہوئے ہے۔!

ہماری عوامی زندگی کے چند گوشوں میں عورت کی بیداری کے آثار پیدا ہو چکے ہیں وہ آگے بڑھنے کے لئے مصروفِ عمل ہو چکی ہے لیکن اس بات کا کیا علاج کہ ماضی پرست لوگ ابھی تک عورت کو مردہ روایات کے دائرہ میں رکھنے کے لئے سر توڑ کوشش کرتے ہیں۔۔ زندگی کی جملہ اقدار بدل چکی ہیں۔ ذہن بدل چکے ہیں۔ اندازِ فکر میں تغیر آ چکا ہے۔ اب وہ پہلے سے موضوعات بھی نہیں رہے اور تعجب کی بات یہ ہے کہ ہمارا رجعت پسند طبقہ بھی ان تمام تبدیلیوں کو محسوس کر رہا ہے۔ لیکن اس کی یبوست اور ذہنی دقیانوسیت اسے ماضی کے دھول سے باہر نہیں نکلنے دیتی۔

زمانے کے نئے حقائق اور قدیم روایات میں ایک زبردست تصادم کے تمام امکانات پیدا ہو چکے ہیں اور اگر یہ تصادم ہوا تو اس میں کس کی جیت ہوگی اور کس کی شکست۔ اس بارے میں زندگی کی قدیم تاریخ بڑی واضح روشنی ڈال سکتی ہے۔

تاریخ کا یہ فیصلہ ہے کہ ہر پرانی تہذیب کو نئی تہذیب میں جذب ہونا ہی پڑتا ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ اس تصادم کے بعد تاریخ اپنے اس غیر متزلزل اور ناقابلِ شکست فیصلہ ہی کو دہرائے گی۔

عورت کی اس مظلومیت کا باعث تعلیم کا فقدان ہے۔ ہمارے کہنے کا یہ مقصد نہیں کہ یہ فقدان صرف عورتوں میں ہے۔ بلکہ مرد بھی ابھی تک تعلیم

کی روشنی سے دور ہیں - اگر مردوں کے ذہنوں اور دلوں میں علم کی روشنی ہوتی اور وہ عورت کی اہمیت اور عظمت کو سمجھ لیتے تو آج کی عورت یوں مظلوم نہ ہوتی - لیکن ابھی تک مرد طبقہ علم کی دولت سے تہی ہے اور اس کی یہ تہی دامنی اسے احساس دیگراں کے جذبہ سے دور رکھے ہوئے ہے وہ عورت کو حقیقی زاویہ کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا - وہ عورت کو اولاد پیدا کرنے والی مشین اور بچے پالنے والی خادمہ ہی سمجھتا ہے - حالانکہ وقت کے ہاتھوں نے اسی خادمہ کے سر پر کبھی کبھی ہیرے جواہرات سے مزیّن تاج بھی رکھا ہے۔

غیر ممالک کی عورتوں کی زندگی پر ایک نگاہ ڈالنے سے اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ ترقی کے میدان میں عورت نے کیا مقام حاصل کر لیا ہے - وہ زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی صلاحیتیں دکھا رہی ہے - وہ ایک بلند پا سائنسدان ہے - وہ ایک اونچے درجے کی ڈاکٹر، مفکر اور انجینئر ہے - وہ مرد سے زیادہ کماتی ہے - مرد سے زیادہ کام کرتی ہے - اور یہی وجہ ہے کہ مرد اس کا احترام کرنے پر مجبور ہے - ہم لوگ روایتی انداز میں یہ کہہ دیتے ہیں - کہ مغربی ممالک کی ترقی کا راز اس بات میں ہے کہ وہاں عورت کا بے حد احترام ہوتا ہے لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ وہاں کی عورت نے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر مرد کو اپنے احترام کے لئے مجبور کر دیا ہے - مرد عورت کی دل سے قدر اور عزت کرتا ہے - یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مغربی ممالک میں طلاقوں کا بڑا زور ہے لہذا مرد کی نگاہ میں وہاں عورت کا کوئی احترام نہیں ہے - یہ سمجھنا غلط ہے کہ طلاق کا جو مفہوم ہمارے ہاں لیا جاتا ہے وہاں طلاق کے لفظ کا یہ مفہوم نہیں ہے - وہاں طلاق کے یہ معنی ہیں کہ دو فریق کسی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکے اور وہ بخوشی ایک دوسرے

سے علیحدہ ہو گئے ہیں ۔ اس طلاق کا نہ مرد کو ملال ہوتا ہے اور نہ عورت اس سے متاثر ہوتی ہے ۔ اس لئے کہ وہاں عورتیں مردوں کی محتاج نہیں ہیں وہاں دونوں فریق زندگی کی سطح پر ایک دوسرے کے ہم سطح ہیں ۔ اس لئے غیر ممالک میں طلاقوں کی تعداد کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا غلط ہے کہ وہاں کے مرد عورتوں کا احترام نہیں کرتے ۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو وہاں کی عورتیں صحیح معنوں میں آزاد ہیں ۔

ہمارے ملک کی پڑھی لکھی عورتیں غیر ممالک کی عورتوں کے ان حقائق سے بے خبر ہیں وہ اب اچھی طرح جان چکی ہیں کہ زندگی کس ڈگر پر رواں دواں ہے ۔ آزادی کی فضا نے عورت کو کیا کیا اختیارات دیئے ہیں ۔ ہمارے ہاں کی عورتیں اس امر کو تسلیم کرتی ہیں کہ مشرق اور مغرب میں ایک نمایاں فرق ہے ۔ لیکن وہ اس فرق کے طلسم کو بھی سمجھ چکی ہیں جنہیں مرد محض اپنی بالادستی کو برقرار رکھنے کے لئے قائم کئے ہوئے ہیں ۔ وہ نئی زندگی کے ہر شعبہ میں کام کرنا چاہتی ہیں ۔ اور مرد ہیں کہ اس روش کو گمراہی کا نام دے کر ........ اس پر بڑی کڑی تنقید کر رہے ہیں ۔ بعض خاندانوں میں عورت کے جذبات کی نہ صرف قدر کی جاتی ہے بلکہ اس کے ضمن میں ان کی حوصلہ افزائی بھی کی جاتی ہے اور وہ خاندان حقیقی معنوں میں ایک خوشگوار زندگی بسر کر رہے ہیں ۔ لیکن رجعت پسندوں کی تنقید سے وہ بھی محفوظ نہیں ہیں اور مشرقی روایات کا سہارا لے کر وہ اکثر نئی روشنی کے دلدادہ خاندانوں کو مطعون کرتے رہتے ہیں نہ جانے یہ کورانہ روش کب ختم ہو گی ۔ نئے سورج کی کرنیں زندگی کے خاکدان میں داخل ہو چکی ہیں اور اندھیروں کے پرستار ابھی تک اپنے خیالات کی تاریکیوں سے یوں چمٹے ہوئے ہیں ۔

جیسے یہ تاریکی ہی ان کی حقیقی زندگی ہے ۔ سورج کی روشنی اور دن کے اجالوں کا اعتراف نہ کرنا کورچشمی ہی کی دلیل تو ہے ۔

اس میں شک نہیں ۔ کہ بعض خاندانوں میں عورت کی پرواز فکر اور آئینہ کردار پر گمراہی کا گرد وغبار پڑا ہوا دیکھا گیا ہے بے راہروی اور آوارگی کی حد تک وہ فیشن کے جنون میں مبتلا ہے اس سے ایسی حرکات سرزد ہو رہی ہیں جو مشرق کی روایات کے سراسر خلاف ہیں جن کی وجہ سے معاشرہ میں ایک جذباتی اور ہیجانی کیفیت پیدا ہو گئی ہے ۔ ایسی خواتین پر ناقدین کی تنقیدیں بجا ہیں لیکن ان ناقدین کو اس قدر احتیاط تو ضرور کرنا چاہیئے کہ کم از کم وہ عورتیں ان کی تنقید کا ہدف نہ بنیں جو اپنی مشرقی روایات کے دائرہ میں رہ کر نئے دور میں ایک نئی سطح پر ابھر رہی ہیں ۔ زمانے کی بدلتی اقدار تو اس کائنات کے ضوابط میں سے ایک ضابطہ ہیں اور وہی قوم زندہ رہ سکتی ہے جو اس ضابطہ کی پابند ہو ۔ زندگی کی بساط پر ابھرنے والی ہر تبدیلی کسی نہ کسی مقصد کے تحت ہوتی ہے اور وہ خود بھی ایک مقصد رکھتی ہے ۔ اگر عورت بھی کسی تبدیلی کی ہمنوا بنتی ہے تو اس کا یہ مقصد ہے کہ وہ زندگی کو آگے بڑھانے کا اقدام کرتی ہے ۔ اس اقدام کی حوصلہ افزائی کرنے کی بجائے اسے کوسنا کوئی مستحسن بات نہیں ہے ۔ اس طرح عورت کی ذہنی ترقی ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے ۔ اور جس کا خمیازہ ساری قوم کو بھگتنا پڑے گا ۔

عورت ـــ سرچشمۂ حیات ہے ۔ وہ کسی روپ میں بھی ہو اس کائنات کی ایک جاندار حقیقت ہے ۔ ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ مغربی کی عورت آزادی اور آزاد خیالی کا آئینہ لیے ہے ۔ یا مشرقی

عورت آزادی کے حقیقی مفہوم سے ابھی تک دور کیوں ہے یا ایسا کیوں ہے کہ وہ جدید رجحانات کی جنون کی حد تک دلدادہ ہے ہمیں صرف دو باتیں دیکھنا ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ عورت نے نئے رجحانات کو کس حد تک اپنایا ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ان نئے رجحانات نے اس کے کردار پر کیا اثرات مرتب کئے ہیں۔ بات صرف ایک ہے لیکن اس کا مفصل تجزیہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ نئے رجحانات اور اس کے نتائج کو ایک عورت نے کس حد تک قبول کیا ہے اور کس حد تک تسلیم کیا ہے۔

ہم میں سے بعض ایسے خوش فہم مرد بھی ہیں جو ایک جوان عورت کو محض جذبات کا مجموعہ سمجھتے ہیں اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ نئے دور میں وہ جن رجحانات کی علمبردار بن گئی ہے وہ اس کی فطری خامیوں کا نتیجہ ہیں۔ یہ تصور سراسر غلط ہے سمندر میں جب طوفان آتا ہے چھوٹی چھوٹی کشتیاں الٹ جاتی ہیں اور بڑے بڑے جہاز تھوڑی دیر ڈگمگانے کے بعد سنبھل جاتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ سمندری طوفان سے چھوٹی کشتیاں تو متاثر ہوں اور بڑے جہازوں پر اثر نہ ہو۔ اثر دونوں پر ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ بڑے جہاز میں زیادہ قوت دفاع ہوتی ہے جب کہ یہ قوت چھوٹی کشتیوں میں کم ہوتی ہے۔ لیکن اس طوفان کا اثر یکساں ہوتا ہے کیونکہ طوفان کی قوت مسلم ہے!!

اسی طرح زندگی جب کسی انقلاب کی آندھی کی زد پر آتی ہے تو اس کا ہر گوشہ متاثر ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کوئی گوشہ زیادہ متاثر ہوتا ہے اور کوئی کم۔ ہم اگر تھوڑی دیر کے لئے بے راہروی کو ایک طوفان سمجھ

بس تو بات حل ہو جاتی ہے یعنی اس طوفان سے عورت زیادہ متاثر اس لئے ہوتی ہے کہ اس میں دفاعی قوت بہت کم ہے ۔ اور مرد میں دفاع کی قوت زیادہ ہے ۔ اس لئے وہ کم متاثر ہوتا ہے ۔ اس کلیہ کے تحت عورتوں پر تنقید کرنا دانش مندی کی بات نہیں ہے ۔ تنقید کی بجائے اسے مخلصانہ انداز میں سمجھانے کی ضرورت ہے جس طرح کوئی مشفق باپ اپنی جوان بیٹی کو سمجھاتا ہے ۔ اسی طرح ان ناقدین کو بھی ایک مشفق باپ کی طرح سمجھانا چاہیئے جو مقصد اس مخلصانہ فہمائش سے حاصل ہو سکتا ہے ۔ وہ تنقید سے ممکن نہیں ۔ لہذا یہ ضروری تھا کہ ہمارے ملک کی عورتیں نئے رجحانات کو وقت کے ضابطہ کے تحت اپنائیں ۔ اب رہا نتائج کا سوال ۔ تو اس سوال کا جواب بھی یہی ہے کہ عورت نئے رجحانات سے پیدا ہونے والے نتائج کی خود ذمہ دار ہے ۔ آخر وہ یہ تو سوچ سکتی ہے کہ خوشگوار نتائج ہی اس کی زندگی کو خوشگوار بنا سکتے ہیں ۔

# تمباکو نوشی کے اثرات

یہ عنوان اگرچہ پرانا اور فرسودہ ہے اور بارہا اخبارات اور رسائل نے اس کو اپنے کالموں کی زینت بنایا ہے مگر آج بھی اس کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں آیا - چنانچہ اگر ہم قدرت کی اس فیاضی پر نگاہ ڈالیں جو اس نے اس کائنات میں بسنے والوں کے لئے عام کی ہے اس کے بارے میں سوچیں اور اس کا تجزیہ کریں تو ہمارے لئے یہ ایک گونہ مشکل ضرور ہے جہاں ہم کسی ایک چیز کا فائدہ دیکھتے ہیں وہاں نقصانات بھی اسی قدر ملتے ہیں -

موجودہ وقت میں تمباکو نوشی معاشرے کے نوے فیصد افراد کی عادتِ ثانیہ بن چکی ہے - اِس عادت میں ہمیں مختلف کردار کے لوگ ملتے ہیں جن کے خیالات مختلف ہیں بعض تمباکو نوشی کے عادی ہوتے ہیں اور بعض محض تکلف کے طور پر یہ شوق پورا کرتے ہیں - وہ لوگ جو تمباکو نوشی کے عادی ہوتے ہیں وہ اس کی تعریف میں قصیدے پڑھتے رہتے ہیں - وہ

لوگ جن کی نظر میں اس کی اہمیت ہے اور اس کی افادیت پر یقین رکھتے ہیں ان میں سے چند ایک کے خیالات آپ بھی سن لیجئے اس سلسلے میں ایک عادی تمباکو نوش کا کہنا ہے :-

"تمباکو سوسائٹی کی جان ہے اس کے بغیر معاشرے میں زندہ رہنا ذلالت کی زندگی بسر کرنے کے مترادف ہے"

ایک اور صاحب جو اپنے آپ کو اچھے تمباکو نوشوں میں شمار کرتے ہیں ان کے الفاظ ہیں"

"تمباکو نوشی میں یک جہتی ہے یہ خیالات کو مستحکم کرتا ہے اور افکار کو بلند"

یہ تعریف تو ایسے حضرات کے منہ سے سُنی گئی جنہیں ہم جاہل بھی کہہ سکتے ہیں مگر ایک سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کا ارشاد بھی قابلِ غور ہے۔

"تمباکو نوشی اندھیرے میں اجالے کا کام کرتی ہے یہ ایک غزل ہے اس سے شاعری کی طرح ملک اور قوم کی خدمت کی جا سکتی ہے یہ تنہائی کا واحد سہارا ہے"

گاؤں کے ایک نمبردار صاحب کی بھی سنئے:

"تمباکو ہاضمے کو درست کرنے کے لئے اکسیر ہے راستے کا ساتھی اور چار آدمی ایک جگہ جمع کرنے کا واحد ذریعہ ہے"

ان چند تعریفوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ معاشرہ کن حالات کا شکار ہے۔ اس کو پراگندہ کرنے میں کن لوگوں کا ہاتھ ہے؟

کون ہے جو تمباکو نوشی کی دعوت دے رہا ہے۔ یہی وہ خیالات اور تعریفیں ہیں جو معاشرے کو تیزی کے ساتھ پراگندہ کر رہے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا

ہے کہ ماہرین حیاتیات اس بارے میں کیا کہتے ہیں ؟ ان کے خیالات میں اس کی کیا اہمیت ہے ؟ انہوں نے تمباکو نوشی کے کیا نتائج اخذ کئے ؟

جرمنی کے ایک ماہر ڈاکٹر ایلیٹ "ELET" جو انیسویں صدی کے مصلحین میں شامل ہیں ۔ تمباکو نوشی کے بارے میں اپنے خیالات اس طرح ظاہر کرتے ہیں ۔

"تمباکو نوشی موت کو دعوت دینا ہے ۔"

روس کے ایک مشہور ڈاکٹر جان سن "JANSAM" اپنی کتاب لائف میں واضح الفاظ میں لکھتے ہیں ۔

"مچھر کے بعد اگر انسان کا کوئی دشمن ہے تو صرف تمباکو۔ اس کا پہلا کش دل پر اثر کرتا ہے اور بدن میں ایک ناقص حرارت پیدا کرتا ہے ۔"

لاہور کے روزنامہ میں ایک بار تمباکو نوشی کے یہ اثرات بیان گئے گئے ۔

"سو سال کی زندگی ساٹھ سال کی زندگی رہ جاتی ہے دل کمزور ہو جاتا ہے ۔ آنکھوں کی بینائی میں فرق آجاتا ہے کھانسی مستقل ہو جاتی ہے اور آخری سانس کھانسی کے بعد نکل جاتا ہے منہ سے بدبو آتی ہے اور دانت ہمیشہ کے لئے خراب ہو جاتے ہیں ۔"

ان خیالات و افکار کو سامنے رکھے بغیر بھی اس کے بارے میں غور کریں تو سوائے نقصان کے اور کچھ نظر نہیں آتا ۔ بے شمار افراد نے اس کے نقصانات بیان کئے ۔ ملکی اور غیر ملکی ڈاکٹروں ۔ حکیموں نے اس کے استعمال سے روکنے کی کوششیں کیں ۔ اگر ہم معمولی سا غور کریں تو محض اس نتیجے پر

پہنچنے کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا کہ اس کے ذریعہ ملک کا قیمتی سرمایہ ضائع ہوتا ہے بے شمار جانیں تلف ہو جاتی ہیں اور لوگ ایسے امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں جن سے بچنا دشوار ہو جاتا ہے "دمہ" اس کے اثرات کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ کثرت سے جو لوگ تمباکو نوشی کے عادی ہوتے ہیں وہ دمہ کے مریض ہوتے ہیں اور تمام دن بلغم تھوکتے رہتے ہیں جس کے جراثیم دوسری بیماریاں پھیلانے میں مدد دیتے ہیں۔

مزے کی بات یہ ہے کہ ہر شخص اس سے اتفاق کرتا ہے کہ تمباکو نوشی مختلف امراض کا باعث ہے۔ یہ ایک لعنت ہے اس سے گلے میں خراش رہتی ہے۔ سر میں چکر اور سینے میں دھوئیں کے بادل گردش کرتے ہیں۔ ذہنی طور پر ایسا انسان کبھی خوش نظر نہیں آتا۔ اور مستقل طور پر تباہی کے راستے پر گامزن رہتا ہے۔ موت ہر وقت اس کے دروازے پر کھڑی آواز دیتی ہے اکثر لوگوں کا ہارٹ فیل تمباکو نوشی کی وجہ سے ہوا ہے فٹ پاتھ پر جو لوگ صبح کو مردہ ملتے ہیں وہ بیشتر تمباکو نوشی کے عادی ہوتے ہیں۔

ملک میں جو طبقہ غریب کہلاتا ہے اس کے روزمرّہ کے خرچ میں سب سے زیادہ خرچ تمباکو نوشی کا ہوتا ہے۔ مفروض ہمیشہ تمباکو نوش ہوتا ہے۔ بہر کیف معاشرے میں جس قدر گندہ طبقہ ملے گا۔ وہ تمباکو نوشی کا عادی ہوگا۔ اور ایک عارضی تسکین کی خاطر مستقل خطرہ مول لیتا ملے گا اس کے بعد جو کچھ دیکھنا باقی رہ جاتا ہے۔ وہ "نفسیاتی" اور "جنسیاتی" ہے۔

نفسیاتی طور پر اس کے کیا نقصانات ہیں؟ تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اس حرکت کا تعلق زندگی کے اُن عملی پہلوؤں سے ہے جن کے لئے زندگی ایک انمول موتی قرار دی گئی ہے انسان جیسی زندگی کا خواہشمند

ہوتا ہے - نفسیاتی طور پر تمباکو نوشی کے بعد ایک ایسے ماحول میں گم ہو جاتا ہے۔ جہاں سے واپس لوٹنا مشکل ہے - اس کی مثال بالکل ایسے ہی ہے جیسے ایک مچھلی سارے جل کو گندہ کرتی ہے - ایک عادی تمباکو نوش باقی ساتھیوں کو بھی خراب کرتا ہے - اس کے اثرات ملیریا کے جراثیم سے کم کام نہیں کرتے۔

جنسیاتی طور پر اس کا تعلق نہ صرف خود اپنی ذات سے ہے بلکہ پورا معاشرہ اس کی لپیٹ میں آتا ہے - ہم یہیں پر اکتفا نہیں کر سکتے - جنسی حیثیت سے ایسا انسان ایک چکر میں پھنس جاتا ہے یہاں چکر سے مراد یہ ہے کہ ذہنی طور پر انسان کبھی بھی اپنی زندگی کے اس ساتھی کو خوش نہیں رکھ سکتا جس کا تعلق ہمیشہ کے لئے اس کے ساتھ ہوتا ہے - یہ رشتہ ہم اس کے اپنے پیدا کردہ ماحول کے اس حصے کو کہہ سکتے ہیں - جہاں انسان کے کم از کم آٹھ گھنٹے گزرتے ہیں یہ حصہ اس کی اپنی بیوی ہے۔

جب ہم موجودہ اور آنے والی نسلوں کے بارے میں سوچتے ہیں تو رووُاں رووُاں کانپ اٹھتا ہے جب یہ سوچا جاتا ہے کہ آج کا انسان کمزور کیوں ہے؟ اور آئندہ آنے والی نسل کمزور کیوں پیدا ہو گی جب یہ سوالات ذہن میں آتے ہیں تو اس کا احساس شدت اختیار کر لیتا ہے اور یہ شدت ذہن میں صرف ایک ایسا سوال پیدا کرتی ہے جس کا تعلق جنسی ہے - سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک تمباکو نوش کمزور اولاد پیدا کرتا ہے؟

ہم اس حقیقت سے نہ انکار کر سکتے ہیں اور نہ منکر ہیں - کمزور دماغ باپ کی اولاد تمباکو نوشی کا نتیجہ ہوتی ہے اور ایسے بچے ہمیشہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں - تعلیمی میدان میں جو لوگ کمزور ہوتے ہیں وہ یا تو خود تمباکو نوش ہوتے ہیں - یا پھر عادی تمباکو نوش کی اولاد ہوتے ہیں -

تجربہ اس بات کا شاہد ہے کہ وہ شخص جو تمباکو نوشی کا عادی ہوتا ہے بزدل ہوتا ہے۔

ایسا انسان وقتی طور پر نشے میں گم ہو کر اپنے آپ کو بھول جاتا ہے اور اس کے بعد جو حرکات وہ کرتا ہے وہ کس قدر خطرناک ہوتی ہیں؟ اس کے بارے میں آج کا ہر شخص واضح طور پر جانتا ہے۔ ملک کے ستر فیصد جرائم تمباکو نوشی کے رہین منت ہیں۔ اگر ہم ان کی گہرائی میں جائیں اور جرائم پیشہ لوگوں کا مطالعہ کریں تو سو فیصد مجرم تمباکو نوشی کے عادی ملیں گے۔ ان میں سے اکثر گھٹیا قسم کے نشے کے عادی ہوتے ہیں۔ یہاں گھٹیا قسم سے یہ مراد ہے کہ وہ ایسا گندہ تمباکو استعمال کرتے ہیں جس سے ان کا دل و دماغ بیکار ہو جاتا ہے۔

تمباکو خواہ بڑھیا ہو یا گھٹیا یہ ہر حالت میں خطرناک ہے۔ اس کے نتائج برے ہیں اس کے افعال خطرناک اور اس کا استعمال مستقل تباہی!

# ہماری عادتیں

"ہم جن چیزوں کو اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں وہ درحقیقت ہماری اچھی عادتیں ہیں اور جن چیزوں کو ہم اپنی بدنصیبی قرار دیتے ہیں - وہ ہماری بری عادتیں ہیں۔ انسان عادتوں کا مجموعہ ہے - وہ اس کو بنانے اور بگاڑنے میں بڑی مدد دیتی ہیں - ہم ان عادتوں پر اگر فتح حاصل کر لیں تو اپنی زندگی کو درخشاں کامیاب اور کامران بنا سکتے ہیں"۔

بلیشتر اس کے کہ میں ان عادتوں پر بحث کروں چند الفاظ عادت کی تشریح میں کہنا چاہتا ہوں - عادت ہماری روزانہ بول چال میں ایک بنیادی لفظ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے - ہم جب کسی سے گفتگو کرتے ہیں تو عام طور پر اسے عادت کا الزام دے کر چپ کرا دیتے ہیں - یا اسی طرح عادت کا لفظ استعمال کر کے ہم کسی شخص کے کسی فعل کو مستحسن قرار دے دیتے ہیں۔ اور اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں - میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہم اس

لفظ کے اندر خدا جانے کتنے انسانی افعال و اعمال کو ڈھال سکتے ہیں اور شائد آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ عادت ہمارے کردار کے اندر کس قدر اہم کام سر انجام دیتی ہے اور اس سے ہم اپنی زندگی کو کس قدر بگاڑ اور سنوار سکتے ہیں۔

اگر ہم اپنے روزمرہ کے افعال کا جائزہ لیں اور اپنے گردوپیش کا مطالعہ کریں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں بعض ایسے حضرات سے سابقہ پڑے گا جو کسی محفل میں جانے سے جھجکتے ہیں۔ اور کچھ ایسے لوگوں سے بھی ملاقات ہو گی جو اپنے آپ کو ہر ماحول اور ہر سوسائٹی میں ایک عام فرد کی حیثیت سے متعارف کرواتے ہیں۔ اور اس طرح بے دھڑک بات کرتے ہیں کہ ان کے اس طرز بے تکلفی سے کوئی آدمی بیگانگی کا شبہ تک نہیں کر سکتا۔ یہ معمولی سے انسانی جذبات و احساسات کا حادثہ فی الحقیقت انسانی عادت کے سوا کچھ بھی نہیں۔

ہم روزمرہ کے معاملات میں جب کسی جذبہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں یا اس کے سامنے اپنا بے پناہ دلی لگاؤ ظاہر کرتے ہیں تو پھر یہ جذبہ نازک شکل اختیار کر جاتا ہے۔ اس کو ہم ایک الجھن یا **Complex** کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ بعض حضرات اسے جنون۔ شدید جذبہ اور ضبط کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ہمیں اس بات سے بحث نہیں کہ اس کی خاطر کن الفاظ سے کی جاتی ہے۔ بلکہ ہمارے نزدیک یہ تمام افراط و تفریط کے مسائل بلا شرکت غیرے عادت کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔

آپ کو ایسے لوگوں سے ملاقات کے لمحات بہرحال ضرور آئے ہونگے۔ جو سوسائٹی میں ایک اعلےٰ رکن بننے کے متمنی ہیں۔ زیادہ صاف ستھرا رہنے

کو پسند فرماتے ہیں۔ گھریلو معاملات میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ سیاسیات پر گھنٹوں بیٹھے بحث کئے جاتے ہیں۔ غرضیکہ روزمرہ کے معاملات میں ایسے لوگ آپ سے ضرور ملے ہونگے۔ جن میں کوئی نہ کوئی عادت ضرور پائی جاتی ہے۔ جس سے ہم ان کے اخلاق و اعمال کو پرکھتے ہیں اور لین دین کا معاملہ ان سے انہی خطوط پر طے کرتے ہیں۔ اور لوگوں کو چھوڑ کر اگر ہم اپنا جائزہ لیں اور اپنے روزمرہ کے معاملات پر دھیان دیں تو وہ باتیں جن کو ہم دوسرے لوگوں پر لازم کرتے ہیں ان کے وجود کو خود اپنے اندر تسلیم کریں گے۔ یعنی ہوشیاری۔ درشتی۔ چالاکی۔ صفائی۔ سستی۔ چستی۔ کاہلی۔ بکواس۔ خاموشی اور چڑچڑاہٹ اور صبر و ضبط جیسی لامتناہی عادتوں کو ہم خود اپنے اندر مطالعہ کریں گے ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ عادتیں ہماری اسی طرح حاصل کی ہوئی ہیں جس طرح دوسروں کی وہ عادتیں جو اوپر گنوائی جاچکی ہیں۔ آپ کو یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہمارے روزمرہ کے وہ افعال جن کو ہم غیر معمولی اور غیر اہم سمجھتے تھے، وہ درحقیقت ہماری عادتیں ہی ہیں۔ جو کہ ہم نے مسلسل محنت و ریاضت سے حاصل کی ہیں۔ اس میں بحث حسن و بد سے نہیں بلکہ صرف عادت کے مفہوم سے ہے۔

مسئلہ اب عادت کی تعریف کا نہیں اور نہ ہی اس پرکھ کا ہے کہ کونسی چیزیں اس کے دائرہ عمل میں ہیں۔ بلکہ اب ہم عادتوں کے متعلق بہت سی چیزوں سے واقفیت رکھتے ہیں اس لئے اب ہمیں یہ دیکھنا ہے۔ عادتیں کیسی بنتی ہیں۔ ان کی قوت کیا ہے۔ اچھی عادتیں کس طرح بنتی ہیں اور بری عادتوں سے کس طرح احتراز کیا جا

سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی انسان ان مسائل کو سمجھ سکے۔ اور اپنی بری عادتوں کو ترک کر کے اچھی عادات پیدا کر لے اس طرح جہاں اپنی روح کو آرام وسکون پہنچائے گا وہاں فلاحِ انسانیت کا پہلو بھی روشن رکھ سکے گا۔

آج کل، ماہر نفسیات اس پر بڑی تحقیقات کر رہے ہیں اور کافی مواد اکٹھا کر کے کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ اور ان میں اسی ایک نکتہ کو مرکز بنایا گیا ہے۔ خصوصًا پروفیسر ملز اور ڈولز نے تو اس بات پر زور دیا ہے کہ وہ طریقہ وعمل جن کو ہم کردار۔ جذبات۔ خبط جنون وغیرہ کے نام سے یاد کرتے ہیں وہ دراصل اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ ہم نے ان کو ایک مدت سے کافی محنت سے سیکھ لیا ہے۔ اور جس طرح ہم کسی چیز کو سیکھ سکتے ہیں اسی طرح فراموش بھی کر سکتے ہیں کیونکہ انسان کے دماغ میں قبولیت اور بھول جانے کی دونوں صلاحتیں یکساں موجود ہیں۔

ہماری عادتیں وہ محکم اور معیاری طریقے ہیں۔ جن سے ہم زندگی کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح عادتیں ہی وہ اوزار ہیں جن سے ہم زندہ رہنے کا قرینہ سیکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ تمام طور وطریق جن کے ذریعے ہم کام کرتے ہیں۔ محسوس کرتے ہیں اور سوچتے ہیں ہماری عادتوں کے زمرہ میں شمار ہوتے ہیں۔

اس نظریہ کی حمائت میں بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں ہماری روزمرہ کی زندگی میں ہزاروں انسان ایسے ہیں جنکو زندگی کے لمحات کی تقسیم کچھ اس منظم طریق سے کرنی پڑتی ہے۔ کہ وہ یقینًا اس کے بغیر

اپنی مشین کو حرکت میں نہیں رکھ سکتے۔ مجھے اس سلسلہ میں ایک مثال آپ کے سامنے پیش کرنا ہے۔ یہ واقعہ ایک اچھی عادت کے انسان کا ہے۔ جس نے مالی خود اعتمادی پر قابو پا کر کس طرح اس روپے کو اپنے قبضے میں کر لیا جو ہماری تمام ذہنی الجھنوں پریشانیوں، ناکامیوں اور خوشیوں کو پامال کرنے والا عنصر ہے۔ یہ مثال چونکہ ایک انگریزی کتاب سے منقول ہے۔ اس لیے اس کا کردار بھی غیر ملکی ہے۔

ڈک غربت میں پیدا ہوا۔ وہ ابھی بچہ ہی تھا کہ اس پر مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ گھر جو غربت و افلاس اور ناداری کا بے مثل نمونہ تھا۔ اس کے لیے کسی شعبہ زندگی میں معاون نہ ہو سکا لیکن وہ غیرت مند اور بہادر نوجوان اپنی غربت پر فتح پانے کے لیے میدان عمل میں نکل آیا۔ اپنے سامنے ایک لائحہ عمل رکھا اور اپنا نام ایک سکول میں لکھوا تعلیم شروع کر دی۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد کالج کی تعلیم شروع کی۔ اور تمام منازل طے کرتا ہوا بی۔ اے تک تعلیم حاصل کر گیا۔ شادی کر لینے کے بعد اس کے سامنے روپیہ سب سے اہم مسئلہ تھا۔ اس پر قابو پانے کے لیے اس کی کہانی اس کی زبانی ہی سنیے۔

"میں نے اپنی عادت بنا لی تھی۔ کہ روپیہ کو اس وقت تک خرچ نہ کرتا تھا جب تک اس کو حاصل نہ کر لیتا تھا۔ اور یہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنی آمدنی کا بیشتر اپنے مستقبل پر خرچ کروں گا۔ مثلاً تین سال تک بالکل سینما نہ دیکھا۔ اگر میرے پاس صرف ایک وقت کے کھانے کے پیسے ہوتے تو صرف ایک وقت ہی روٹی کھاتا۔

میری شادی کے بعد ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ جب میرے بچے بھی تھے۔ میرے پاس خرچ کے لئے معمولی رقم باقی رہ گئی اور ایک مدت تک مزید رقم ملنے کی توقع نہیں تھی۔ میں نے اور میری بیوی نے اس تمام رقم کو لفافوں میں بند کر کے رکھ دیا اور جملہ اخراجات کا بجٹ بنا لیا۔ بچوں کو یہ بات بتادی گئی کہ جب کھانا سامنے سے ختم ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اور کھانا نہیں اسی لئے اسی پر اکتفا کیا جائے۔ اس طرح کچھ عرصہ گذر گیا میں نے دوسرا چیک وصول کیا۔ اور اس وقت بھی میری جیب میں ایک سینٹ موجود تھا۔"

اس سے ہمیں اندازہ ہو گا کہ ڈک نے کونسی عادات کو اپنایا اور اپنے مستقبل کو روشن کیا۔ ڈک نے کمانے کے ساتھ سلیقہ سے خرچ کرنے کی طرف زیادہ توجہ دی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ کمانے سے خرچ کرنا زیادہ مشکل ہے۔ ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق اپنی ضروریات زندگی کے لئے تھوڑا بہت کما لیتا ہے۔ لیکن بہت کم ایسے ہیں جو اس کمائے ہوئے کو اپنی عقل و دانش اور سلیقہ سے خرچ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

یہ مثال صرف اس لئے پیش کی گئی ہے۔ کہ انسان کی ہر کامیابی، ہر مسرت یا ناخوشی کے پردے میں اس کی عادت کارفرما ہوتی ہے۔ یہ عادت ہی ہے۔ جس کو انسان اپنے کسی خاص مقصد یا ارادے کے حصول کے لئے پیدا کرتا ہے۔ اور پھر مسلسل جدوجہد کرنے کے بعد اس کو مقصد کے حصول میں کامیابی ہوتی ہے۔ ہماری عادت کا مقصد زندگی کے کسی نہ کسی شعبہ سے متعلق ہوتا ہے۔ یعنی عادت ہی ہمارے

کام کا وہ معیار ہے۔ جس سے ہم اپنی زندگی کا سکون واطمینان حاصل کرتے ہیں۔ المختصر یہ کہ عادت ہی ہمارے کارگل گینتی کو سنوارتی اور بگاڑتی ہے

عادتوں کے بننے کے سلسلے میں ماہرین نفسیات نے کافی تحقیق کی ہے۔ وہ اصول جو اس تحقیق کی روشنی میں اخذ کئے گئے ہیں ہم ان کی صحت سے انکار نہیں کر سکتے۔ ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ" ہم کسی چیز کا پتہ لگانے یا پانے کے لئے اپنے آپ کو اس کی عادت ڈالتے ہیں۔ اس کے معانی یہ ہیں کہ جب کوئی مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ یا ہم کسی مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔ تو ہم کو اس کے لئے ایک طریق کار معین کرنا پڑتا ہے۔ جس سے ہم مطمئن ہوتے ہیں۔ اور یہی طریق کار جو ہم معین کرتے ہیں معیاری بن کر ہماری فطرتِ ثانیہ بن جاتا ہے۔ کیونکہ اس سے ہم کو کامل سکون اور اطمینان ہوتا ہے۔ یہ ہمارے ماحول کے مطابق ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسی سے ہماری انا کو تسکین ملتی ہے۔"

یہ تھا چالیس سال کی تحقیق کا نتیجہ جو ہمارے محققین کی محنت وکاوش سے وجود میں آیا۔ ہمارا مدعا یہ نہیں کہ ہم قارئین کو بڑی بڑی اصطلاحوں اور تکنیکوں کے چکر میں ڈال دیں۔ اور ان تمام افراد کی فرداً فرداً رائے کا اظہار کریں۔ بہر حال جو بات ہمارے پیش نظر ہے وہ عادت ہے۔ اور اس دور کی تعریف سے ہر بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ کہ عادت ہمارے مقرر کردہ طریقِ کار کا دوسرا نام ہے۔ جس پر ہماری پسندیدگی اطمینان اور سکونِ قلبی کی مہر بن گئی ہوئی ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ چند مثالوں سے آپ کو یہ بات سمجھاؤں۔

آپ ان مثالوں سے ضرور باخبر ہوں گے کہ فلاں عورت نے زیورات اور کپڑوں کی غرض سے خود کو دکاندار کے حوالے کیا۔ اور اپنی غرض کی اشیاء حاصل کیں۔ شائد کچھ لوگ اسے اس کی قلاشی کا نام دیں۔ لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ کیونکہ دیکھا گیا ہے۔ کہ ان میں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں۔ جن کے گھر میں ان اشیاء کی کمی نہیں ہوتی بلکہ یہ زیورات اور پارچات ان کی کمزوری بن گئے ہوتے ہیں۔ جسے دوسرے الفاظ میں ہم اس کی عادت کہتے ہیں جس کے لئے وہ کسی قسم کا برا فعل عار نہیں سمجھتی۔

مجھے اس ضمن میں ایک کالج کی طالبہ کی مثال یاد آئی جو اکثر ہم جماعت طالبات کی دعوتیں کرنے میں کافی مشہور و معروف تھی۔ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی لیکن اس قدر خرچ کا باران کا گھرانہ بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اور اس کے لئے وہ اپنی عصمت جیسے گوہر کا سودا کر دیتی تھی۔ حالانکہ دعوتوں کی کثرت اس ماحول کا رواج نہ تھا اس سے صرف وہ اپنی گردن اپنی ہم جولیوں کے سامنے اکڑی رکھتی تھی اور اس سکون کو حاصل کرنے کے لئے وہ کسی نامناسب کام کی متحمل ہونے سے بھی گریز نہیں کرتی تھی۔

اسی طرح ہم ایک خاص قسم کا لباس پہننے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ جب ماحول میں مروجہ لباس کو پہنتے ہیں تو ایک خاص قسم کی لذت و مسرت حاصل کرتے ہیں۔ جس سے ہم کو ایک سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ دوسرے لوگ بھی ہمارے لباس کو ایک خاص انداز سے دیکھتے ہیں جس سے ہم متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور اس طرح

ہمیں اپنی برتری کا احساس ہوتا ہے۔ اور ہم اپنے اس ردِ عمل سے خوش ہو جاتے ہیں۔

یہی ایک جذبہ ہے جس کے تحت ہم ایک زبان کو سیکھتے ہیں۔ اہل زبان کی تہذیب اور معاشرت کو قبول کر لیتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ اس معاشرے کا ایک فرد بن جانے کی وجہ سے ایک سکون اور لذت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ لیکن اتفاقاً ہمیں کسی ایسے مقام پر جانا پڑ جاتا ہے جہاں کے لوگوں کی زبان۔ طرزِ تکلم، معاشرت، انداز، گفتار مختلف ہو تو وہ چیزیں جو ہمیں وہاں آرام پہنچاتی تھیں ہمارے لئے اس بدلے ہوئے ماحول میں عذاب اور سوہان روح بن جاتی ہیں۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک عادت ڈالنے کی صحیح راہ ہماری نظروں سے مدتوں اوجھل رہتی ہے۔ لیکن بعد از بسیار ریاضت وہ گوہر ہمیں مل جاتا ہے۔ جس طرح ایک ریسرچ کرنے والا برسوں تاریک راستوں میں بھٹکتا ہے۔ پھر کہیں جا کر اس کو اپنی منزل ملتی ہے۔ ہم سب سے زیادہ قوی دلیل اس کے حق میں یہی دے سکتے ہیں کہ ایک ماہر تعلیم اپنے شاگرد کو ایک فن میں ماہر کرنے کے لئے کم وقت لیگا۔ جبکہ وہی فن ایک نو آموز خود حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ تو زیادہ وقت لیگا۔

غرضیکہ آپ اگر حالات کا جائزہ لیں اور خود اپنے حالات کا مطالعہ کریں تو آپ محسوس کریں گے کہ ہم سوچنے اور کام کرنے کے لئے ایک راستہ متعین کرتے ہیں۔ اور ایک خاص طریق سے اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اور یہی وہ خاص انداز ہے جو عادت کہلاتا ہے۔ ہمیں یہ جان

لینا چاہیئے کہ اس سے بہتر طریق ہمارے سامنے اور کوئی نہ تھا جسکو ہم اختیار کر کے اپنا کام مکمل کر سکتے اور کامل سکون و اطمینان حاصل کرتے۔ اور یہ عادت ہم میں اسی لئے منتقل ہو گئی۔ اور پھر یہی رفتہ رفتہ ہماری طبیعت کے ساتھ مطابقت کرتی گئی اور بعد میں فطرتِ ثانیہ بن گئی۔

اس مختصر سی بحث کے بعد میں اس بات کی کوشش کروں گا کہ وہ حالات آپ کے سامنے بیان کر دیئے جائیں جن کو سمجھ کر ہم اپنی عادتوں پر قابو پا سکتے ہیں۔ حیران کن بات یہ ہے کہ انسان جو ساری کائنات کو بدلنے اور فضا کو مسخر کرنے پر تلا ہوا ہے۔ آج بھی اپنی حقیقت اور افکار کی دنیا سے دور ہے۔

بقول علامہ اقبال ؂

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کو
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اس سے پہلے میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ عادت کا پتہ ہم کو اس وقت لگتا ہے جب وہ ہماری روح کے رگ و ریشے میں داخل ہو چکی ہوتی ہے۔ اور زندگی کا ایک جزو لاینفک بن جاتی ہے۔ چونکہ اسی سے ہم اپنی زندگی کا مقصد حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے اس کو ہم بے کار باتوں کا مجموعہ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ عادت ہماری زندگی نہیں۔ بلکہ زندگی گذارنے کا ایک محض آلہ ہے۔ وہ خود کوئی مقصد نہیں۔ بلکہ ہم کو مقصد کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے۔

اگر انسان عمل ذہانت کا ثبوت دے تو اپنی عادتوں پر قابو پا سکتا ہے۔ اور پھر اپنی قسمت یا تقدیر کا دھارا بدل سکتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کو اپنا غلام بنا سکتا ہے۔ کائنات کی تسخیر کے پروگرام بنا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ عادت کا ہی کرشمہ ہے کہ انسان کو اپنا مقصدِ زندگی حاصل کرنے کے لئے پہاڑ سے بھی ٹکرا دیتی ہے فرہاد کو کوہکنی میں مصروف کر دیتی ہے۔ مجنوں کو صحرا نوردی کی دعوت کے لئے پکارتی ہے اور شاعر کو سیر گلگشت کے لئے ابھارتی ہے۔

جب ہماری کامیابی و کامرانی کا انحصار ہماری قسمت پر نہیں بلکہ ہماری عادتوں پر ہے۔ تو عادتیں لاعلاج نہیں بلکہ ان کو بدلا جا سکتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق موقع و محل کی نزاکت کے پیش نظر تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے بڑے فہم و ادراک کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ہمیں اپنی کسی عادت کی حقیقت کا اس وقت تک پتہ نہیں چلتا جب تک ہم اس کی تہ تک پہنچنے کی کوشش نہ کریں۔ محض زبانی عہد و پیمان۔ وعدے اور ارادے اس راہ میں ناکام رہ جاتے ہیں۔ مثلاً آپ عہد کر لیں کہ آئندہ اپنی دوستی کو زیادہ مستعدی سے نبھائیں گے۔ مالک یا آفیسر سے دل کھول کر گفتگو کریں گے۔ پریشان ہونا چھوڑ دیں گے تو صرف زبان سے ہر اقرار کر لینا ہی اچھے نتائج پیدا نہ کر سکے گا۔ جب تک آپ اپنے خیالات کو اسیر نہیں بنائیں گے۔ اپنی فکر کا راستہ تبدیل نہیں کریں گے اور اس پر قابو نہیں پائیں گے۔ اور یہ ساری باتیں علم النفس کے بغیر آپ کی قدرت سے باہر ہیں۔

تربیت نفس کو ہماری زندگی میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔

اس کے بغیر جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ ہم اپنی کسی عادت پر بھی قابو نہیں پا سکتے۔ تربیتِ نفس کے بارے میں میرے سامنے ایک بے مثال نمونہ موجود ہے۔ جس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انسان کٹھن سے کٹھن مرحلوں میں بھی آسانی سے گذر جاتا ہے۔ بشرطیکہ اس کو اپنے نفس پر قدرت حاصل ہو۔

ایک دفعہ حضرت علی کسی جہاد میں مصروف تھے دشمن آپ کی تلوار سے کٹ کٹ کر میدان میں گر رہے تھے۔ اچانک ایک شخص آپ کے سامنے بڑے فخر و غرور سے اور انفرادی مقابلہ کے لئے آمادہ ہوا۔ آپ نے اس کی دعوت کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ کافی عرصہ مقابلہ جاری رہا عدِ مقابل کا گھوڑا زخمی ہو گیا۔ اس نے پیادہ لڑائی جاری رکھی حضرت علی بھی گھوڑے سے اتر آئے۔

لڑائی دیر تک جاری رہی آخر آپ نے کافر پر فتح پالی اور اُسے چاروں شانے چت گرا دیا۔ حضرت علی خنجر لے کر اس کے سینے پر سوار ہو گئے۔ اسے قتل کرنا چاہتے تھے۔ کہ اس نے گستاخی کی اور آپ کے چہرۂ انور پر تھوک دیا۔ اگر اور کوئی ہوتا تو ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر اس ناپاک و ناہنجار کے سینے میں خنجر گھونپ کر چشمِ زدن میں اسے کیفرِ کردار تک پہنچا دیتا لیکن حضرت علی جن کی تربیتِ نفس اپنی مثال آپ تھی وہ چپ چاپ اس مردود کے سینے سے اتر آئے وہ شخص آپ کے اس رویہ سے سخت حیران و پریشان ہوا اور متعجب ہو کر سوال کیا کہ آپ کا میری اس گستاخی پر درگذر کا رویہ۔ چہ معنی دارد؟ آپ نے فرمایا کہ میں جہاد خدا کے نام پر کر رہا تھا۔ اور تجھے صرف اس فعل کی یہ سزا دینا چاہتا تھا کہ تو نے

خدا کو جھٹلایا ہے لیکن اب جبکہ تو نے اس فعل بد کا ارتکاب کیا ہے تو اس میں میری ذاتی غرض بھی شامل ہو گئی ہے۔ اس لئے اب میں تجھے نہیں ماروں گا۔

عادت پر قابو پا لینے اور مرض کو قابلِ علاج بنانے کے لئے اس کی بُری جڑوں تک رسائی کا ایک طریق ہمارے ہاں آزادیٔ گفتار کا بھی ہے۔ یہ نفسیاتی علاج کا ایک فنی پہلو ہے۔ انسان کے دماغ کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی باتوں کو اس طریق سے سامنے لایا جا سکتا ہے۔

اس طریق میں انسان کو مربوط فکر کی بجائے آزادی خیالات کا ماحول دیا جاتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ ایک مسئلہ کو سامنے رکھ کر اس پر منطقی رنگ سے سوچنا شروع کر دے اور خیالات کو ایک ترتیب دینا شروع کرے۔ اس کے برعکس اسے بولنے کی پوری آزادی دی جاتی ہے اور اسے بتایا جاتا ہے کہ وہ جو کچھ اس کے ذہن میں آئے کہتا جائے اپنے دل کی ہر بات کھول کر بیان کرے اور اس کے لئے اسے اس کی مرضی کے مطابق ماحول میسر کیا جاتا ہے۔

مریض کو ہر موضوع اور خیال پر بے دھڑک خیال آرائی کا موقع دیا جاتا ہے۔ اس کو آزادی ہوتی ہے کہ وہ تمام واقعات وحادثات خواہ اس کے بچپن جوانی یا بڑھاپے سے متعلق ہوں۔ بلاکم وکاست بیان کرتا چلا جائے۔ خواہ ان کا تعلق ماضی سے ہو یا حال و مستقبل سے خواہ اس کی آغوش میں غم والم کی داستانیں پلی ہوں یا عیش وعشرت کی محفلیں لگی ہوں۔ خواہ اس کے بیان میں کسی خود غرضی اور سرد مہری کا ذکر ہو یا کسی سے بے پناہ محبت و قربانی کا قصہ ہو۔ غرضیکہ انسانی زندگی جن واقعات سے

دوچار ہوئی ہے اور اس تصویر میں جو رنگ آئے ان کے متعلق اسے پورا اختیار ہے کہ وہ کسی پہلو سے ان کی تشریح کرے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ اس طرح کے خیالات بیان کرنے میں وہ جذبات کی رو میں بہتا ہوا ایسی باتیں بھی کہہ جائے گا۔ جس سے ماہرین کو اس کے مرض کی تشخیص میں آسانی ہو گی۔ اور خیالات کے اسی انبار میں وہ ایک چنگاری بھی پنہاں ہوتی ہے جو انسان کے اس سارے خرمن کو سلگا رہی ہوتی ہے اور عنقریب ہی اس کے لئے ایک خطرہ کا ماحول پیدا کر رہی ہوتی ہے۔

ہم خود بھی اس مسئلہ پر غور و خوض کر سکتے ہیں ہمیں اپنے دماغ کو آزاد چھوڑ دینا چاہیئے اور خیالات کا ایک لامتناہی سلسلہ خواہ وہ بے ربط ہی کیوں نہ ہو آنے دیں ان خیالات میں خواہ کوئی انتہائی احمقانہ خیال ہی کیوں نہ ہو یا کوئی خراب جذبہ ہی کیوں نہ ہو اسے روکنے کی بجائے پورے طور پر اپنے ذہن پر اسے چھا جانے دیجیئے۔ اگر ہم کچھ بھی سوچ نہ سکیں۔ تو گھبرانے کی بجائے دماغ کو سوچنے کی طرف متوجہ کریں۔ اور دماغ سے تمام قیود ختم کر دینی چاہیئے اور اسے خیالات کی دنیا میں تنہا چھوڑ دینا چاہیئے۔

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

آپ بھی دل و دماغ کو کبھی تنہا چھوڑ دیجیئے اور بغیر کسی شرم جھجک یا کسی پریشانی کے جو خیالات پیدا ہوتے ہیں انہیں قبول کیجیئے۔

ہم دیکھ چکے ہیں۔ کہ ہماری عادتیں کس طرح بن جاتی ہیں اور پھر یہ بات بھی فہم و ادراک سے بالا نہیں رہی کہ ان عادتوں کو ہم کس

طرح سمجھ سکتے ہیں ۔ اس کے بعد ہمارے لئے راستہ کھلا ہے ۔ کہ ہم اپنی ان عادتوں کو سمجھ کر اپنی زندگی کو ایک خوشگوار اور پرامن راستہ سے وابستہ کر کے شاندار مستقبل کے مالک بھی بن سکتے ہیں ۔ اور انہیں خراب عادتوں پر عالم بے خودی میں اگر عمل کئے جائیں تو اپنے لئے خوفناک حالات پیدا کر کے زندگی کو تباہی کے موڑ پر بھی لا سکتے ہیں ۔

وہ شخص جو اپنی عادتوں کو قابو میں رکھ سکتا ہے ۔ خیالات کو قابو میں لا سکتا ہے ۔ دنیا میں بڑی سے بڑی کامیابی بھی اس در پر سجدہ ریز ہو گی ۔

اگر ہم بحیثیت انسان کے زندہ رہنے کے متمنی ہیں اگر ہماری یہ خواہش ہے کہ ہمارا گھر جنت کا نمونہ ہو ۔ ہمارا کام ہمارے مقصد کے تابع ہو ۔ زندگی کے ہر پہلو پر مسرت و شادمانی کا عالم ہو ۔ تو ہم کو ایسی عادتیں بنانا پڑیں گی جو ہم کو غم و الم کی دنیا سے دور لے جا کر کامیابی و کامرانی کی دنیا میں پہنچا دیں ۔

# اصلاحِ معاشرہ

ابن خلدون کے خیال کے مطابق معاشرہ جن عوامل سے متاثر ہوتا ہے وہ تین ہیں ۔ دین جغرافیائی حالات اور اسباب حیات کی فراوانی ۔ دین چونکہ زندگی کے مخصوص زاویہ نظر سے تعبیر ہے جس کو قومیں سمجھ سوچ کر اپناتی ہیں اور اس بنا پر اپناتی ہیں کہ اس نقطہ نگاہ کو پوری طرح اپنے فکر و عمل میں سمو سکیں ۔ یہ کس حد تک موثر ثابت ہوتا ہے اور فکر و عمل اور عادات و مالوفات کے کن کن رخوں پر اپنا اثر ڈالتا ہے ۔ اس سے ہر کوئی واقف ہے ۔

لفظ معاشرہ سے ایک ایسی اجتماعیت کا مفہوم ذہن میں ابھر آتا ہے جس میں بلا امتیاز رنگ و بو افراد مل جل کر زندگی بسر کریں اور اصلاح معاشرہ کے معنی ہیں ۔ اس اجتماعیت کے ہر گونہ افراد کو چند باقاعدہ مثبت اصولوں کا پابند کر دینا جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے ہر طرح مکمل ، حسین اور ان

احکامات کے عین مطابق ہوں۔ جو اس طاقت کی طرف سے ہم عائد ہوتے ہیں جو فہم و ادراک کا سرچشمہ ہے اور جس کی بالاتری سب پر مسلمہ ہو۔

آج ہم ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جس میں اجتماعیت کے پُرزے تعطّل کا شکار ہو رہے ہیں۔ یہ دور

اک صبح کہ جس میں نہ اُجالا نہ اندھیرا
اک کشتیِ جذبات نہ اِس پار نہ اُس پار

کی تصویر بنا حساس طبائع کے لئے حیرت و استعجاب بنا ہوا ہے۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ مستقبل کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ زندگی کے ہر شعبے میں بے انصافیوں کی بھرمار ہے پطرس بخاری مرحوم کے قول کے مطابق "آج کا انسان انفرادی طور پہ بالکل جاہل ہے" ـــــ اور یہ جاہلیت اس کی اجتماعیت پر بُری طرح سے اثر انداز ہو رہی ہے۔ معاشرتی افراد مجروح ہو کر انسانیت کے دروازے پر انصاف کی بھیک مانگنے کے لئے مسلسل دستک دے رہے ہیں۔ آج کی تمام جدوجہد اور مساعی فلاح و بہبود کی نسبت تباہی و بربادی کے لئے زیادہ برسرِپیکار ہے۔

یہ سب کچھ تو ہے اور بظاہر لاعلاج بھی نظر آتا ہے۔ لیکن ہمت کے گھوڑے مشکلات کی مہیب خندقوں سے دندناتے ہوئے پھلانگ جایا کرتے ہیں تاریخ میں ہمیشہ اعتقادات اور نظریات کی قوتوں نے حرکت پیدا کی ہے۔ معاشروں کے قافلے اعلٰے نصب العین کے جرس کی آواز پر گامزن ہوتے ہیں۔ اور کوئی عجب نہیں کہ آج بھی اجتماعی زندگی کی تاریکیوں کو بقعۂ نور بنا دیا جائے۔

اک تذبذب میں گرفتار ہے اس دور میں دنیا
ورنہ مشکل تو نہیں آج بھی انساں ہونا!

اصلاح معاشرہ کے لئے نظریات و افکار کی صحیح منزل کی طرف راہنمائی کرنا سب سے بڑی احتیاج ہے جو تعلیم کے فراواں اور ارزاں ہونے کی صورت میں پایہ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے ۔ رسول پاکؐ کی یہ حدیث کہ "علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور مسلمان عورت پر فرض ہے" ہمارے لئے مشعل راہ ہے ۔جب تعلیم کی مشعلیں اور چراغ فروزاں ہوں گے تو جہالت کی تاریکیاں صفحہ ہستی سے عنقا ہو جائیں گی ۔ بغض و عناد کے وہ بھوت فنا ہو جائیں گے جو ہمارے معاشرے کی ترقی کی راہ میں دیوار ہیں ۔ افراد کے اندر خود بینی اور جہاں بینی کا حسین امزاج پیدا ہوگا ۔ جو ان مسائل کو حل کرنے میں معاون ثابت ہوگا ۔جن کے اثر و نفوذ نے اجتماعی راہوں کو پامال کر دیا ہے اور معاشرے کو مفلوج ؛

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایسے وسائل کی بھی ضرورت ہے جو سیاسی، معاشی اور تجارتی لحاظ سے ہمیں خود کفیل کر دیں، اور خدا کا شکر ہے کہ سرمائے، ذرائع و وسائل، خام پیداوار، فنی مہارت اور انسانی محنت کی جو قوتیں آج ہمارے ہاں منتشر ہیں یہ اگر اسی مقدار میں منظم ہو جائیں اور ان کو تعاون کے ساتھ کام میں لایا جا سکے تو ارتقاء کی وہ منزلیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ ایک زندہ حقیقت بن کر ہمارے سامنے آ سکتی ہیں ؛

وہ معاشرہ جس کی بنیاد ہم نے رکھی ہے ۔ ایک ایسا معاشرہ ہے جس کے ارتقاء کی حدود بہت وسیع ہیں ۔ نظریات و نصب العین متعین کرتے وقت

مذہب اولین شئی ہے جو ذہن میں آتی ہے اور ہمارا مذہب اسلام، ترقی، تہذیب اور فلاح عامہ کا دین ہے ۔ اور اس کی یہ خصوصیات جن کی صداقت کا لوہا اس کی پیدائش سے لے کر آج تک انسانی معاشرہ میں بے چون و چرا مانا جاتا رہا ہے ۔ ایسی ہیں جنہوں نے کسی لحاظ سے بھی ہمیں بہت زیادہ آگے بڑھ جانے سے نہیں روکا خواہ وہ معیار تعلیم بلند کرنے کا مسئلہ ہو یا معیار زندگی،

بچوں کو بہلانے کے لئے کھلونوں کی ایجاد ناگزیر تھی، اسی طرح انسانیت کو بہلانے کے لیے بعض اصلاحی تحریکات کا قیام ناگزیر تھا ۔ جو آج چار سُو نظر آتی ہیں ۔ اگر ان سے کام لیا جائے تو تعلیم کے بلند ترین مراحل بھی طے ہو سکتے ہیں ۔ ہماری نوے فی صدی آبادی دیہی ہے ۔ اور اگر دیہات سدھار کو ترقی دی جائے تو اکثریت کی دنیا کو سنوارا جا سکتا ہے ۔ امداد اور حفظانِ صحت کے اداروں کی حوصلہ افزائی کی جائے تو ان سے صحت مند قوم پیدا ہو سکتی ہے ۔ اسی طرح دوسری تحریکات کے ذریعوں اور بیچوں کو درست کر کے اصلاحی مشین کو چلایا جا سکتا ہے ۔

آج سینما جو ہمارے معاشرہ کے لئے تباہی کا موجب بنا ہوا ہے اگر ہم معاشرتی، اخلاقی، اصلاحی اور تاریخی فلمیں بنائیں مثلاً جغرافیائی فلموں کے ذریعہ سے زمین اور اس کے مختلف حصوں مختلف قوموں اور ملکوں کی زندگی کے بے شمار پہلو اپنے عوام کو دکھا سکتے ہیں ۔ جن سے ان کو بہت سبق بھی حاصل ہوں گے اور ان کا نقطہ نظر بھی وسیع ہوگا ۔ ہم علم ہیئت کے حیرت انگیز حقائق اور مشاہدات ایسے دلچسپ طریقوں سے پیش کر سکتے ہیں کہ لوگ شہوانی فلموں کی دلچسپیاں بھول جائیں ۔ اور

پھر یہ فلم اتنے سبق آموز ہو سکتے ہیں، کہ لوگوں کے دلوں پر توحید اور اللہ کی ہیبت کا سکہ بیٹھ جائے۔ اسی طرح اور بھی بہت سی فلمیں اسلامی اغراض اور مفید مقاصد کے لئے بنائی جا سکتی ہیں جن سے معاشرہ کی اصلاح ہو۔

دماغی سکون اور اطمینان فی زمانہ ایک ایسا گوہر بے بہا ہے جو اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے، یہ سکون کا فقدان ہی ہے جس کے باعث افراد کی زندگی حقیقی مسرت سے خالی ہے اور معاشرہ بھی طرح طرح کے مصائب و نقائص کا شکار ہے۔ درحقیقت جب تک ہمیں مکمل سکون حاصل نہ ہو ہم نہ اپنے لئے فائدہ مند ثابت ہو سکتے ہیں نہ دوسروں کے لیے...... سکون کی عدم موجودگی ہمیں روحانی، جسمانی اور ذہنی امراض میں مبتلا کرنے کے علاوہ ہم سے ہماری صلاحتیں بھی چھین لیتی ہے..... ہمارا معاشرہ جو کہ سکون سے محروم ہو چکا ہے اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہم اخلاقی حیثیت سے بالکل پست اور دیوالیہ ہو چکے ہیں...... کاش اس معاشرہ میں اخلاقی قدریں از سر نو زندہ ہو جائیں کہ ایک بار پھر ہم ایسی زندگی گزار سکیں جو سکون اور حقیقی مسرت سے بھرپور ہو اور واقعی زندگی کہلانے کی حقدار ہو۔

# غصہ مفید بھی ہو سکتا ہے

"ہونے کو ہر شخص غصہ میں آپے سے باہر ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے بڑے اہتمام کی ضرورت نہیں۔ لیکن ایسے شخص پر غصہ ہونا جو صحیح طور پر اس کا سزاوار ہو، موزوں وقت پر غصہ آنا۔ ایک ایسی بات ہے جو ہر ایک کے بس کی چیز نہیں۔" ارسطاطالیس

پروفیسر واٹسن نے انسانی جذبات کی تین بنیادی اقسام بیان کی ہیں ۱۔غصہ ۲۔خوف ۳۔محبت

ان انسانی جبلتوں میں غصہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چند حالات کے تحت اس پر قابو پا لینا خوف کی نسبت آسان ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم غصہ کے اسباب کو سمجھنے کے قابل ہو جائیں گے۔ اور اپنے اندر اس پر قابو پا لینے کی صلاحیت پیدا کر لیں گے۔ جب حالات اس طرح کی خوشگوار فضا پیدا کر لیں۔ تو پھر ہمیں معلوم ہوگا۔

کہ انسانی شخصیت کو سنوارنے میں اس جبلت کا ہونا بھی لازمی ہے۔

ہمارے ہادیٔ برحق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ کہ غصہ حرام ہے۔ کیونکہ غصہ کی حالت میں انسان بے قابو ہو کر ایسے فعل بھی کر گذرتا ہے۔ جن کی دینِ اسلام میں ممانعت ہے۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ غصہ حلال بھی ہے۔ یہ اس وقت جب ایک شخص اپنے والدین کی رسوائی پر غصہ کرتا ہے۔ یا دینِ اسلام کی حرمت کی خاطر کیا ہوا غصہ۔

غصہ کا بنیادی سبب صرف ایک ہے۔ جس سے کسی کو انکار نہیں یعنی غصہ۔ الجھن کا ردعمل ہے۔ صاحبِ علم و فراست حضرات نے اس کو سمجھنے کی کافی تگ و دو کی ہے۔ اور کافی تحقیقی کام اس پر ہوا ہے۔ پروفیسر واٹسن نے اپنی تحقیق سے نتیجہ اخذ کیا ہے "کہ بچہ کو کسی مادی جبر سے روک دینے پر غصہ آجاتا ہے۔ یعنی بچہ کو اس کا ہاتھ ہلانے سے روک دیا جائے۔ یا ٹی کے پاؤں باندھ دیئے جائیں کہ وہ آگے نہ بڑھ سکے تو ہر دو بری طرح اپنے غصہ کا اظہار کریں گے۔ بچہ کا یہ اظہار غصہ ہے اور اس پر جو حالات پیدا کر کے یہ کیفیت طاری کی گئی ہے۔ وہ غصہ کے اسباب ہیں۔

اس کی زیادہ واضح مثال بنی نوع انسان کے روز مرہ کے افعال سے بھی اخذ کی جا سکتی ہے۔ اگر ہمارا چشمہ یا کتاب کھو جائے۔ صبح دفتر جاتے وقت آپ کا قلم آنکھوں سے اوجھل ہو جائے۔ آپ کے جوتے نوکر نے پالش نہ کئے ہوں۔ کھانا دیر سے آپ کے سامنے لایا جائے۔ آپ کے دروازہ کے سامنے کوئی موٹر کار کھڑی کر دے۔

ڈرائینگ روم میں نیا قالین بچھایا گیا ہے۔ گنوار قسم کا انسان جوتوں سمیت اس پر چلا آئے۔ غرضیکہ روزمرہ کی زندگی میں صبح سے شام تک ان گنت ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ جو انسان کو دیوانہ بنا دیتے ہیں۔ اس کا اندازہ لگانا محال ہے۔ کہ انسان کتنی چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتوں پر جھنجلا اٹھتا ہے۔ لیکن اس تمام کا صرف ایک ہی سبب ہے۔ کہ ہمارے اندر ناکامی اور مایوسی کی وجہ سے الجھن یا جھنجلاہٹ پیدا ہو گئی ہے۔ جس کا اظہار ہم نے اس طریق سے کیا ہے جس کو ماہرین غصہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ تمام حالات ہماری شکست ناکامی اور مایوسی کی غمازی کرتے ہیں۔ اور اس کا بہترین ردعمل غصہ ہے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ ہم پر غصہ طاری ہو جاتا ہے لیکن اس کا سبب ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے۔ بہر حال ہم اس بات کو بخوبی جانتے ہیں۔ کہ اس قسم کی کیفیت کا طاری ہونا احساس شکست۔ کسی خاص صدمہ، یا ناامیدی یا ناکامی کی وجہ سے ہے خواہ وہ شعوری طور پر ہمارے سامنے ہے۔ یا صرف ہمارے لاشعور میں وہ حالات پوشیدہ ہیں۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ انسان غصہ کے جذبات کو بالکل ختم نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ ہماری زندگی کا ایک جزو ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اس جبلت کو کو انسانوں کے ساتھ حیوانوں میں بھی ودیعت کیا ہے جس طرح اللہ تعالےٰ کی ہر تخلیق اپنے اندر اچھا پہلو بھی رکھتی ہے اسی طرح غصہ بھی بذات خود بری چیز نہیں۔

اگر ہر شخص، ہر وقت غصہ کو برداشت کر لیتا اور خاموش رہتا تو شائد اس سے ہم کو کوئی خاص فائدہ حاصل نہ ہوتا۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ

کوئی آدمی آپ کے منہ پر ایک تھپڑ مارتا ہے۔ تو آپ اپنا دوسرا رخسار بھی اس کے سامنے کر دیجیئے۔ تاکہ وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال لے۔ کیونکہ یہ قانونِ فطرت کے سراسر منافی ہے۔ قانونِ الٰہی کی اصل غائت تو یہ ہے کہ ایک تھپڑ کے بعد ہمارا خون کھولنے لگتا ہے۔ اور ہمیں غصہ آتا ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ میں تو یہی کہوں گا کہ اگر ہم غصہ کو اپنی طبیعت سے علیحدہ کرنا بھی چاہیں تو ہم ایسا مطلق نہیں کر سکتے۔ ممکن ہے ایک انسان یہ تو کر سکے کہ ایک تھپڑ کے بعد دوسرا رخسار بھی پیش کر دے۔ یا کہ ایک شخص سے نقصان اٹھانے کے بعد پھر آپ، کو اسی کے حوالے کر دے۔ اور پہلے خسارہ سے بے نیاز ہو جائے۔ لیکن جب طمانچوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائیگا تو پھر اس کے لئے ضبط مشکل ہو جائے گا۔ اور وہ غصہ سے دیوانہ وار حالات پر قابو پا لینے کی کوشش کرے گا۔ اس شخص کا یہ عمل احوالِ فطرت کے عین مطابق ہوگا۔

ایک انسان غصہ کا اظہار اس طریق سے کرتا ہے کہ اس کے خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے چہرہ آگ کی طرح سرخ ہو جاتا ہے۔ کان کی لویں دہکنے لگتی ہیں۔ رگیں تن جاتی ہیں۔ منہ سے جھاگ نکلنے لگتی ہیں۔ وہ دیوانہ وار بھاگتا۔ دوڑتا اور مارتا ہے۔ گالیاں بکنے لگتا ہے۔ کپڑوں کو پھاڑتا ہے۔ دامن کو چاک کر کے گلے میں ڈال لیتا ہے۔ بالوں کو نوچتا ہے۔ اسی طرح مغضوب اپنے اندر دنیا و جہاں کے ہنگاموں کو جگہ دے دیتا ہے۔ غرضیکہ اس طرح کے انسان کی حالت قابلِ دید ہوتی ہے۔ وہ دیوانہ وار آہ و بکا کرتا ہوا اپنے فعل کو سرانجام

دیتا ہے - اپنی پوزیشن کو بھول جاتا ہے اور اپنے مدِ مقابل سے انتقام لینے کے لئے مستعد ہو جاتا ہے - اس کی اس مضحکہ خیز حالت کو دیکھ کر لوگ اس کا تمسخر اڑاتے ہیں - بعض اوقات ایسا شخص غصہ میں خطرناک کھیل کھیلتا ہے - فریق ایک دوسرے کو جان سے مار ڈالنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں -

انسانی حماقتوں کا اندازہ لگانے اور غصہ کے اس ردِعمل کا جائزہ لینے کے لئے ہمیں عدالتوں اور پولیس سٹیشنوں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا - ہمیں معلوم ہو گا کہ احساسِ شکست کے اس ردِعمل کے نتائج کتنے بھیانک اور خوفناک ہوتے ہیں - ہم حیران رہ جاتے ہیں کہ غصہ کے عالم میں شوہر نے بیوی کو موت کے گھاٹ اتار دیا بیوی نے اپنے سوتے خاوند کے گلے پر چھری چلا دی - باپ اپنے بیٹے لختِ جگر کو بے دردانہ طریق سے قتل کر دیتا ہے - یہ وہ افعال ہیں جو ظالم اور شقی القلب ڈاکو بھی کرنے سے احتراز کرتا ہے - اسی طرح ہم روزمرہ دیکھتے ہیں - کہ انسان احساسِ شکست کا اظہار نہایت بہیمانہ طریق سے کرتا ہے - ابھی چند ماہ قبل کا ہی واقعہ ہے - کہ لاہور میں ایک نہایت ذمہ دار افسر نے احساسِ شکست کے ردِعمل میں اپنے تمام کنبہ کو خود سمیت زہر دے کر مستعار زندگی سے نجات دلائی -

یہ چند ایک کرشمے تھے جو آپ کے سامنے بیان کئے گئے - ہم بہت سے ایسے اشخاص سے متعارف ہیں - جو غصہ کی وجہ سے بڑی بڑی مصائب میں گرفتار رہتے ہیں -

غصہ کے اس طرح کے طوفان روزانہ آتے جاتے رہتے ہیں بعض اوقات ہم خود ان طوفانوں کو اٹھاتے ہیں - لیکن یہ طوفان ہر وقت برے

نہیں ہوتے۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ غصہ بذاتِ خود بری چیز نہیں۔ اس لیے کبھی کبھی اس قسم کے طوفانوں کا اٹھنا زندگی میں حرارت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ لیکن اندھے اور ناقابل تسخیر غصہ کی گرفت میں آجانا بالکل احمقانہ بات ہے۔ جو شخص موسم کے سخت ہونے پر گالیاں بکنے لگتا ہے۔ لوگ اس کو احمق اور بیوقوف سمجھ کر تمسخر اڑائیں گے۔ اسی طرح اگر کوئی ڈرائیور غصہ میں پیچ وتاب کھاتا ہوا موٹر کو ۸۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پرہجوم سڑک پر دوڑانا شروع کر دیتا ہے تو اس احمق کو ہمیں روکنا پڑے گا۔ کیونکہ اس کے اس غیر شریفانہ فعل سے ہزاروں آدمیوں کی زندگی خطرہ میں ہے۔ اور احساسِ شکست کا یہ ردِ عمل درست نہیں۔

لڑائی، جھگڑے، دنگا فساد نہایت ہی برے اور غیر شریفانہ فعل ہیں۔ کیونکہ احساسِ شکست سے نمٹنے کے لیے یہ طریق نہائت غلط اور بے کار ہیں۔ اور بعض وقت بڑے تباہ کن اور خطرناک نتائج پیدا کر دیتے ہیں۔ جب کوئی جذباتی طوفان اٹھتا ہے۔ تو انسان گویا آگ سے کھیلتا ہے۔ ایک متوازن شخص ان حالات میں جذباتی رو میں بہنے کی بجائے اس پر قابو پانے کی تجاویز سوچے گا۔ کیونکہ اگر اس موقعہ پر آگ پر قابو نہ پا یا جائے تو یقیناً آگ ہم پر قابو پا لے گی۔ اور پھر جو بھی اس کی لپیٹ میں آ گئے گا اسے جلا کر بھسم کر دے گی۔

احساسِ شکست کا ایک ردِ عمل یہ ہے جس سے اوپر بحث کی گئی لیکن بعض اوقات اس طرح کے ردِ عمل کا طریق اس طریق سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ ہم نے اکثر دیکھا ہے۔ بچہ جب اپنے ماں باپ سے ناراض ہو

جاتا ہے۔ تو غصہ کے عالم میں اس کے منہ سے والدین کے لئے الفاظ نکلتے ہیں: "خدا کرے تو مر جائے" بچہ اپنی خام عقل اور کم فہمی کی وجہ سے جذبات کا اظہار کھلے الفاظ میں کرتا ہے۔ سن بلوغت تک پہنچنے کے وقت والدین کے لئے، لاکھ ناسازگار حالات پیدا ہونے کے باوجود بھی، نوجوان اس قسم کے ناشائستہ الفاظ استعمال نہیں کر سکتا۔ لیکن پھر بھی ہمارے لاشعور میں یہ خواہش پوشیدہ رہتی ہے۔ اس کا اظہار ہم خواب میں کرتے ہیں۔ کیونکہ اس وقت ہماری اخلاقیات کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ اسی طرح بعض وہ الفاظ یا بات جو کبھی کہہ نہیں سکتے۔ ہماری زبانی لغزش سے ہمارے منہ سے نکل جاتی ہے۔ بعض وقت انسان غصہ کا اظہار اس طریق پر بھی کرتا ہے کہ کسی کی شادی کا پیغام بھول جاتا ہے۔ خوشی کے موقع پر اپنے دوست کو دل کھول کر مبارک نہیں دیتا۔ دو کاروباری دوست ایک دوسرے کے کاروبار سے حسد کرتے ہیں۔ اور احباب کی محفل میں دوسروں کی برائیاں گنواتے ہیں۔ یہ بھی احساس شکست کا ردِعمل ہے۔ میرے ایک دوست جو اکثر اپنے کاروبار کی تعریف کرتے ہیں۔ اور جب بھی محفلِ احباب میں موجودہ معاشرہ کے کاروبار کے نقائص بیان کئے جاتے ہیں وہ ہمیشہ اس کو دوسروں تک محدود کر دیتے ہیں اور صرف اپنے متعلق صفائی پیش کرتے ہیں۔ یہ بھی احساسِ شکست سے ان کا نمٹنے کا طریق ہے۔ بعض اوقات ہنگامی حالات کے تحت ہم کہہ دیتے ہیں کہ ان حالات میں اگر کوئی دوسرا زندگی گذارے تو بقول شاعر ؎

"میرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی"

بعض وقت شاعر لوگ اپنے اس ردِعمل کو مرثیہ کی شکل دیتے ہیں۔

مجھے بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار شاہانِ مغلیہ کی ناکامی اور شکست اچھی طرح یاد ہے۔ اس ضمن میں مجھے ایک غزل یاد آئی جو بہادر شاہ ظفر کے احساس شکست کی آئینہ دار ہے۔ مضمون کے اعتبار سے ساری غزل لکھنا تو موزوں نہیں صرف ایک شعر پہ اکتفا کروں گا جو غزل کا مطلع ہے۔ ؎

دعا ہے یہ آتش عشق میں تو بھی میری طرح سے جلا کرے
نہ نصیب ہو تجھے بیٹھنا تیرے دل میں درد اٹھا کرے

ایک دوسرا شعر عرض ہے ؎

رہے نامراد رقیب بھی --- نہ خدا دکھائے اسے خوشی
نہ نصیب شربتِ وصل ہو سدا زہرِ غم تو پیا کرے

پوری غزل پڑھ لینے کے بعد ظفر کے اظہار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا احساسِ شکست کا ردِعمل کس قدر ہے۔ بحث غزلیات وادبیات نہیں ہے۔ بلکہ ردِعمل کے اظہار سے ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی ایک غزل جو اس سے بالکل مختلف احساسِ شکست کا ردِعمل لئے ہوئے ہے ؎

جو کام کسی کے نہ آسکوں میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

بعض اوقات ہم اس احساس کا اظہار بڑے ہی عجیب طریق سے کرتے ہیں۔ اس کی مثال میں اس طرح دوں گا۔

جب ہم پر شکستگی کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو ہمارا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ تو ہم کو ہر چیز دھندلی اور بے کار نظر آتی ہے۔ ہم کو یہ دنیا فانی اور اس کی ہر چیز فنا ہو جانے والی نظر آتی ہے۔ دنیا کی ہر خوشی و مسرت ہمارے لئے زہر بن جاتی ہے۔ اور عیش و نشاط کی محفلیں بے کیف معلوم ہوتی ہیں۔ ان حالات میں ہم اس سرائے فانی میں رہنے کو حماقت قرار دیتے ہیں۔ ہم

کو موت اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ نظر آتی ہے۔ہم کو زندگی، دنیا، انسان اور یہ کارخانۂ عالم ہر چیز بے کار بے کیف اور عبث نظر آتی ہے۔ لیکن جب ہم اپنی متوازن حالت پر آتے ہیں۔ تو یہ غم کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور نیلا نیلا آسمان اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ہمارے سامنے ہوتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ زندگی ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ دوست ایک نعمت غیر بدل ہے۔ ہمارا گھر، کھانا، پینا۔ غرض ہر ایک چیز ایک نعمت ہے۔ ہم پھولوں کو دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں۔ جانوروں کی خوش الحانیوں پر وجد کرنے لگتے ہیں۔ دریا کی روانی سے متاثر ہوتے ہیں۔ نغمات سے روح میں مسرت و شادمانی چٹکیاں لیتی ہے۔ غرضیکہ ہم کو ایک ایک ذرۂ کائنات میں زندگی کا پیغام ملتا ہے۔ جذبی نے ان متضاد انسانی کیفیات کا نقشہ شعر میں یوں کھینچا ہے ؎

میری نظر کی مستی سے سب شیشۂ و ساغر رقصاں تھے
میری ہی نظر کی گرمی سے سب شیشہ و ساغر ٹوٹ گئے

غصہ کے مختلف اسباب مدلل بیان کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچ گئے۔ کہ غصہ کے اسباب ہمارے سامنے کئی طور طریق سے آتے ہیں۔ غصہ اپنی اصلی شکل چھوڑ کر دوسرے رنگ میں ہم پر طاری ہوتا ہے۔ غصہ کا سبب بعض اوقات ہماری جسمانی کمزوری اور شکستگی ہوتا ہے۔ آخر پر یہ کہ غصہ تبدیل بھی ہو سکتا ہے۔

اب ہمیں اس بات پر غور کرنا ہے کہ آیا ہم غصہ کو مفید کاموں میں بھی لا سکتے ہیں یا نہیں۔ ہمیں غور کرنے پر معلوم ہو گا۔ کہ بنی نوع انسان نے اس میدانِ عمل میں بھی کافی کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں۔

اپنی اس جبلت پر قابو پاکر انسانوں کے لئے ہزارہا مفید کام کئے ہیں۔ بہت سے موجدوں کے حالات زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔ کہ ایک موجد کئی بار ناکامی سے ہمکنار ہوکر غصہ میں آتا اور پھر تازہ دم ہوکر اسی راستہ پر چلتا حتیٰ کہ منزلِ مقصود اس کے قریب آتی گئی اور پھر ایک دن کامیابی نے اس کے قدم چومے۔ بجلی کے قمقمے جو کہ آج کل ہماری زندگی کی اندھیری راتوں میں اجالے کئے ہوئے ہیں ایڈیسن کی بارہا دفعہ کی شکست وناکامیوں کا ردعمل ہیں۔ اگر ہم بنظرِ غائر کائنات کا مطالعہ کریں تو تمام کامیابیوں میں ہمکو غصہ کی یہی جھلک ملے گی۔ اسی کی وجہ سے انسان نے ہواؤں کو مسخر کیا۔ کیونکہ انسان ان کی تندی اور سختی سے نالاں تھا۔ سمندر کو اپنی سرکشی پر ناز تھا۔ لیکن وہ اس سے بھی زیادہ سرکش نکلا۔ اسے سمندر کی ان بیہودگیوں پر غصہ آیا اس لئے اسے اسیر بنانے میں کامیاب ہوا۔ اسی طرح اسے اپنی بے دست وپائی کا خیال ستانے لگا۔ چنانچہ فضا کو مسخر کرنے اور اس پر حکمرانی کی غرض سے ہوائی جہاز ظہور میں آیا۔ یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے انسان نے فضاؤں کو، ہواؤں کو، ذرات کو غرضیکہ کائنات کی ہر چیز پر فتح حاصل کی۔ یہی وہ جذبہ ہے جو انسان کو بڑے سے بڑے کام کرنے اور سخت قسم کے خطرات سے ٹکرانے پر مجبور کر دیتا ہے۔

غصہ کا اثر ایک بلی یا کتے پر اس قدر پڑتا ہے کہ وہ انہیں حالات سے ٹکر لینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اور وہ اپنے حریف کو خاطر میں نہیں لاتا۔ یہی وجہ ہے کہ مرغے بے حد زخمی ہونے پر بھی اپنے مدِمقابل کو یونہی چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے۔

احساسِ شکست کا ردعمل ہی وہ محرک ہے جو کمزور سے کمزور انسان کو

اپنے سے دس گنا طاقت ور انسان سے نبرد آزما ہونے کے لئے تیار کرتا ہے۔ غصہ کی حالت میں انسان کے اندر فوق الفطرت قوت یکجا ہو جاتی ہے غصہ اندھی اور طوفان کی طرح انسان کو کہاں سے کہاں اٹھا کر لے جاتا ہے۔ ان باتوں سے معلوم ہوا کہ غصہ کتنی مفید اور کار آمد چیز ہے۔

غصہ بذاتِ خود بری چیز نہیں اور ہمارے اندر اس کا وجود خدا کی ایک سب سے بڑی نعمت ہے۔ لعنت نہیں۔ جب ہم پر احساسِ شکست یا ناکامی کا جذبہ طاری ہو جاتا ہے۔ اور ہمیں جب کبھی کسی کام کے کرنے سے روک دیا جاتا ہے۔ تو اس وقت ہم فطرت کی اس عطا کردہ قوت سے کام لیتے ہیں جو ہمارے اندر پوشیدہ ہے۔ اور یہ قوت عام حالات میں ہمارے کام نہیں آتی بلکہ ہنگامی حالات سے برسرِ پیکار ہونے کے لئے ہماری اندر ہماری جسامت سے کئی گنا زیادہ طاقت مجتمع کر دیتی ہے۔ یہی وہ خزانہ ہے جسے ہم عرفِ عام میں غصہ کے نام سے پکارتے ہیں اس قوت کے خزانے کو قدرت نے اسی لئے ہمیں ودیعت کیا ہے کہ ہم اس سے کام لے کر اپنے حریف پر غلبہ پا سکیں۔ راستے کے سنگِ گراں کو ہٹا کر کامیابی کی منزل تک پہنچ سکیں اگر ہمیں مقاصد کی تکمیل پر روکا جائے تو جدوجہد کر کے اپنے جذبۂ شکست کو جذبۂ کامرانی میں تبدیل کر سکیں۔

اگر انسان اس قوت و طاقت کے گرانقدر خزانہ کو بے جا استعمال کرے گا تو اس کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کا جائز استعمال اسے بے بہا فوائد عطا کر سکتا ہے۔

میرے سامنے اس قسم کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ جن سے اس کی وضاحت بخوبی ہو سکتی ہے۔ میرے ایک دوست کے ہم جماعت نے ایک دفعہ

اپنے بڑے بھائی کا قصہ بیان کیا۔ جو کہ آج کل فوج میں کیپٹن کے عہدہ پر فائز ہیں۔ ان کے بھائی گھر سے دور کالج میں تعلیم حاصل کرتے تھے ابھی ایف۔اے بھی پاس نہ کرنے پائے تھے۔ کہ ایک دفعہ گھر خرچ لینے کے لئے آئے روپے کے اس قدر بے دریغ خرچ پر باپ نے ڈانٹ پلائی۔ بھائی جان کچھ روپے لے کر اگلے دن صبح کی گاڑی کالج چلے گئے۔ انہی دنوں فوج میں سپاہیوں کے لئے بھرتی کھلی تھی۔ بجائے کالج جانے کے بھائی جان فوج میں سپاہی بھرتی ہو گئے۔ بھرتی ہو جانے کے بعد والد صاحب کے نام خط آیا۔ جس میں ارادہ کی تبدیلی اور نئی ذمہ داری کا ذکر تھا۔ والد صاحب سٹ پٹائے۔ لیکن اب ماسوائے صبر کے اور کیا ہو سکتا تھا؟ بھائی جان کے ذہن پر اپنی شکست کا جذبہ سوار تھا۔ چنانچہ اس کے ردِ عمل میں آپ نے دیانت و ذہانت سے کام کیا اور ۸ سال کی مدت میں کپتان کے عہدہ تک آ پہنچے۔

اس مثال سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس نوجوان نے اپنے غصہ کا استعمال کس طرح کیا۔ اور قوت کے اس خزانے سے جو اللہ تعالیٰ نے اس کو نوازا ہے۔ کس قدر صحیح طور پہ کام لے کر فائدہ اٹھایا۔ اور اپنے آپ کو سر بلند کیا۔ اسی طرح ہر انسان پوشیدہ قدرتی قوت سے پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنے غصہ کا رخ مفید اور بھلائی کے کاموں کی طرف موڑ دے۔

میرے ایک دوست مزے لے لے کر سکول ٹورنامنٹ کی روئداد بیان کر رہے تھے۔ میرے دوست کا ہیرو جماعت ہشتم کا بمشکل سوا پانچ فٹ قد کا درمیانی جسم والا طالب علم تھا۔ یہ کبڈی کا کھلاڑی ہے اور

سالِ رواں کے لئے ضلع کا بہترین کھلاڑی قرار دیا جا چکا ہے۔ کبڈی کا فائنل میچ تھا۔ دو سکول میچ کھیل رہے تھے۔ یہ طالب علم میرے دوست کی سکول ٹیم کا کھلاڑی تھا۔ مدِ مقابل ٹیم جسمانی لحاظ سے اس ٹیم سے اعلیٰ تھی۔ لیکن اس چھوٹے سے مگر گٹھے ہوئے مضبوط جسم کے کھلاڑی نے حریف کو طاقتور خیال کرتے ہوئے اسی احساسِ شکست کے ردِعمل میں اپنے اندر اتنی قوت فراہم کر لی۔ کہ دورانِ کھیل تماشائیوں کا ہجوم اپنی تمام تر توجہ اسی طرف مرکوز کئے رکھا۔ اس نے اپنے سے پانچ گنا طاقتور حریف کو بھی پچھاڑ دیا۔ اور بعض دفعہ اس مضبوطی سے جھگڑا کہ تماشائی انگشت بدنداں رہ گئے۔

اس دوسری مثال سے بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ کہ انسان کس طرح غصہ کو کام میں لا کر اپنا تحفظ کر سکتا ہے اور احساسِ شکست کا بھوت اس پر سوار ہو کر کس طرح اسے جنوں اور پہاڑوں سے ٹکرا دیتا ہے۔

اس روئداد کا دلچسپ پہلو جو انہوں نے سنایا وہ یہ تھا کہ ریفری نے بددیانتی سے کام لیا اور اس ہیرو کو شکست و ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ جب کھیل ختم ہوا تو اب پھر غصہ اور شکستگی کے آثار نمایاں ہوئے۔ اور ٹیم کے کھلاڑیوں نے مد احول سمیت ریفری کے خلاف غیر مہذب الفاظ میں نعرے بلند کئے۔ نعرہ بازی کی وجہ سے دنگا و فساد کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ لیکن ان کے کہنے سے طلبہ خاموش ہو گئے اور خطرہ ٹل گیا۔ بعد ازاں طلبہ نے ریفری کو مارنے کا پروگرام بھی بنایا جسے روک دیا گیا۔

اس کہانی کے بیان کرنے کا صرف یہ مقصد ہے کہ ہر دو صورتوں میں کھلاڑیوں نے احساسِ شکست کا ردِعمل ظاہر کیا لیکن اس کا پہلا طریق مستحسن اور قابلِ قدر تھا۔ مؤخر قدم بربادی اور خرابی کا موجب تھا۔ لیکن ہر دو

اقدام غصہ کی مختلف شکلیں تھیں۔ پہلے ردعمل کی وجہ سے یہ ننھا کھلاڑی ضلع کا بہترین کھلاڑی قرار دیا گیا۔ اور باقی کھلاڑیوں کی بھی قدر جملہ سنجیدہ تماشائیوں کی نظروں میں اعلیٰ وارفع تھی۔ لیکن بعد کے احساسِ شکست کے ردِعمل نے مجمع کے ذہنوں پر برا اثر چھوڑا۔

اگر ہم اپنے غصہ کے رخ کو موڑ کر مفید اور قابلِ فخر کارناموں کے لئے صرف کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس فارمولا پر عمل کرنا ہوگا۔

"آج میں غریب ہوں۔ لوگ مجھ کو دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ لیکن دس بعد میں لوگوں کو دیکھ کر مسکراؤں گا۔ میں اس کام سے نفرت کرتا ہوں۔ میں اس غصہ و نفرت کو مفید کاموں میں صرف کروں گا۔ اور ایک کامیاب زندگی گذاروں گا۔ میں اپنے آپ کو دوسروں کی نظروں میں گرنے نہیں دوں گا۔ خواہ اس کے لئے مجھے کتنی ہی مصیبتوں کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔"

دنیا آپ کو دشمن نظر آتی ہے۔ لیکن آپ کو دیکھنا چاہیئے کہ آپ کا اصل دشمن کون ہے۔ ایک شخص بے علمی میں آپ کا تمسخر اڑاتا ہے۔ اور آپ کے مستقبل پر ہنستا ہے۔ کیا کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ اس کی شخصیت سے متاثر ہیں۔ اور شاید اسی لئے غلیظ گالیاں اسے بک رہے ہیں۔ اگر حالات یہ نہ ہوتے تو شاید آپ اس کو ٹال کر چلے جاتے۔ اس صورتِ حال میں آپ کو اپنا محاسبہ کرنا چاہیئے۔ اور اپنی حالت کو اطمینان اور متوازن بنانے کا عہد کر لینا چاہیئے۔ ہر قسم کے آرام و آسائش کو اپنے اوپر حرام کر لیجئے دن رات سخت محنت سے کام کیجئے حتیٰ کہ دنیا آپ کی اس ترقی اور کامیابی و کامرانی کو دیکھ دنگ رہ جائے۔

اگر آپ احساسِ شکست کے ردِعمل کا رخ مفید کاموں کی طرف موڑنے میں کامیاب ہو جائیں گے ۔ تو آپ کی ترقی اور آگے بڑھنے میں کوئی چیز روڑا نہیں بنے گی ۔ آپ پر جب بھی کبھی کوئی آدمی مسکرائے گا ۔ تو آپ اپنا محاسبہ کریں کہ کونسی آپ میں خامی ہے ۔ جو وجہ تضحیک بنی ہے ۔ اگر واقعی کوئی ایسی بات ہے ۔ تو دنگے فساد اور بحث و تکرار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ آپ کو یاد رکھنا چاہیئے ۔ کہ ہر فقرہ ، جملہ یا وہ بات جس سے آپ کو تکلیف ہوتی ہے ۔ اور جس سے آپ کا خون کھولتا ہے ۔ اس قابل ہے کہ اس پر غور کیا جائے اور اس کا سبب سمجھ کر اس کو مفید کام کی طرف موڑ دیا جائے ۔ یہی کامیابی کا تنہا اور واحد گر ہے ۔

# انسانیت کا وقار

کسی مفکر کا قول ہے کہ "ہر کام اس انداز سے کرو کہ تمہاری انسانیت کا پایہ بلند نظر آئے۔"

اگر بعمق نگاہی سے کام لیں تو یہ باور کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو گی کہ انسانیت کا پایہ انسانی وقار کے تحفظ ہی سے بلند رکھا جا سکتا ہے۔ اور تحفظ کا یہ فریضہ ہمیں زندگی کے لاتعداد مراحل میں سے گزرتے ہوئے ہر ہر قدم پر بجا لانے کے مواقع ملیں گے۔ اگر ہم میں احساس ذمہ داری کسی بھی شکل میں موجود ہے تو بحیثیت انسان ایسے مواقع کو ضائع نہ جانے دیں گے۔ ورنہ حیوانی جبلتوں کے غلبہ کے پیش نظر ہم اپنا ذاتی مقام تک کھو بیٹھیں گے۔

ہم انسان ہیں اور ہمیں اشرف المخلوقات کا درجہ دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے خالقِ کائنات نے بھی ہمیں با وقار تخلیق کیا ہے۔ اسی لئے ہر انسان میں

عزت نفس کا احساس موجود ہے۔ یہ ہر کسی کی خواہش ہوتی ہے کہ اسے عزت و تکریم سے نوازا جائے۔ سوسائٹی میں وہ معزز ہو۔ چھوٹے بڑے سب اس میں دلچسپی لیں۔ اور اس کی خواہشات کا احترام کریں۔ اس کا نام سن کر یوں محسوس کریں جیسے یہ نام جانا پہچانا ہے۔ اور اس نام کی شخصیت مشہور، باوقار اور قابل تقلید ہے۔ یہ خواہش غریب اور امیر، چھوٹے اور بڑے، پڑھے لکھے اور ان پڑھ، مالک اور ملازم، ہر ایک میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ہر انسان زندگی کی جدوجہد میں اسی لئے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے، محنت و مشقت اٹھاتا ہے، طرح طرح کے حیلے بہانوں سے کام لیتا ہے کہ اسے عزت حاصل ہو جائے۔ اسی عزت اور ناموری کے حصول کے لئے دنیا کی تاریخ نے کئی بار اپنے موڑ بدل ڈالے۔ ورنہ آج دنیا کی حالت مختلف ہوتی۔ سکندر دنیا کو فتح کرنے چلا تو یہی جذبہ کارفرما تھا، اکبر نے دین الٰہی بنایا تو اسی سبب کے نتیجہ کے طور پر۔ حالانکہ ان کی حیثیت کچھ معمولی نہ تھی۔ مگر یہ جذبہ ہی ایسا ہے جس کی تسکین اتنی آسان نہیں۔ یہ بہت لچک دار ہے۔ بڑھتا ہے تو بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اس جذبے کے نتیجہ میں بدیہی شہادتیں ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ ہم اکثر اوقات ایسے گھٹیا افعال کے مرتکب ہو جاتے ہیں کہ ہماری عظمت ہمارا منہ چڑانے لگتی ہے۔ اور خود ہمارے ضمیر کے خاموش گوشوں میں طوفان اٹھ اٹھ کر ہمیں ہدف ملامت بناتے ہیں۔ ہمارے ایسے افعال انسانی اقدار کو مجروح کرنے کے باعث ہمارے لئے ذہنی سکون کی تباہی کا سامان فراہم کرتے ہیں جس کا ہمیں شدت سے احساس ہوتا ہے لیکن پھر بھی ہم اصلی محرک کی طرف کم ہی توجہ دیتے ہیں۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے

جیسے کوئی بدبو کے بھبوکوں میں گھر کر ناک پر رومال رکھ لیا کرے اور جس کی غلاظت سے یہ بھبوکے اٹھتے ہیں۔ اس کے تدارک کی طرف متوجہ نہ ہوں۔

یہ عام کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اپنے لئے آپ پسند کرتے ہیں، دوسروں کے لئے بھی وہی پسند کریں۔ یا جو سلوک آپ دوسروں سے روا رکھتے ہیں۔ دوسروں سے بھی اسی سلوک کی توقع رکھیں۔ ذہنی طور پر اگر آپ اس اصول کو اپنا لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ بھی سکون سے زندگی بسر نہ کر سکیں اور دوسرے بھی آپ سے خوش نہ ہوں۔ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ہم اپنی برتری دکھانے کے لئے دوسروں کی تذلیل و تضحیک کو قابل فخر سمجھتے ہیں۔ جب اپنی کسی خوبی کا ذکر کرنا چاہیں گے۔ اور موقع محل نہ ہوگا کہ کر گزریں تو کسی ایسے آدمی کا ذکر شروع کر دیں گے جو وہاں حاضر نہ ہوگا۔ پھر جلد ہی اس کی برائیاں گننے لگیں گے اور پھر اس کا اپنے ساتھ مقابلہ شروع کر دیں گے مثلاً "فلاں آدمی بڑا خود غرض ہے۔ ہم تو بڑے سے بڑا نقصان بھی اٹھا لیں گے مگر ایسی خود غرضی نہیں کریں گے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہم نے فلاں کا یہ کام کیا، فلاں کا وہ کام کیا، فلاں کو اس مصیبت سے نجات دلائی لیکن جتایا تک نہیں" اور اسی طرح اپنا جذبہ خدمت و خلوص کی داستانیں سنانے چلے جائیں گے۔ یہ تو خیر پیٹھ پیچھے کی بات ہوئی سننے والوں میں سے کوئی زیادہ ہی حساس ہوا تو اس نے برا منایا۔ ورنہ سب ہاں میں ہاں ملاتے چلے گئے اور اپنی تسکین کا سامان بھی کرتے رہے۔ لیکن بعض اوقات ہم روبرو بھی ناروا باتیں کہہ جاتے ہیں۔ جس کا مخاطب حقدار نہیں ہوتا۔

دراصل ہم انسانی وقار کو اتنی اہمیت نہیں دیتے جتنی کہ واجب ہے۔

اور فطری طور پر دوسرے کو کمتر بنانے کے لئے سوچتے رہتے ہیں۔ غور کیا جائے تو دوسروں پر اپنی سبقت، خواہ وہ معاشرتی ہو یا سماجی۔ معاشی ہو یا مذہبی، حاصل کرنے کا یہ جذبہ ہی ہے جو تمام فسادات کی جڑ ہے۔ تمام برائیاں یہیں سے اٹھتی ہیں۔ اور وجہ محض یہ ہے کہ اس جذبے میں خلوص شاذ و نادر ہی پایا جاتا ہے۔ حق دار کو حق ملنا تو اولیٰ چیز ہے مگر جو لوگ مستحق نہیں ہوتے وہ زیادہ سرگرم دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ بڑے بڑے جرائم انہیں سرگرمیوں کا نتیجہ ہے۔ اور سزا کا تصور بھی یہیں سے ابھرا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ جرم کی اصطلاح کے معانی مختلف زمانوں میں بدلتے رہتے ہیں۔ اور بعض اوقات کوئی اچھا قدم بھی جرم تصور کر لیا گیا ہے۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جرم و سزا کے متعلق چند خیالات کی توضیح کر دی جائے۔

انسانی زندگی کے ارتقا کی تاریخ انسانی تہذیب کے ارتقا کی تاریخ ہے۔ چونکہ انسان بنیادی طور پر مل جل کر رہنے کا خوگر ہے اس لئے ابتدائی انسان نے اپنے ارد گرد اپنے ہم جنسوں کو جمع کر کے ایک آزاد معاشرہ ترتیب دیا۔ اس معاشرہ میں وہ اپنی جگہ آزاد تھا۔ لیکن بتدریج ایام کے ساتھ ساتھ انسانی انفرادیت اور انفرادی مفادات آپس میں ایک دوسرے سے متصادم ہونے لگے اس لئے اس معاشرے میں اختلال کی صورت پیدا ہو گئی۔ اس اختلال کو دور کرنے اور معاشرے میں تصادم کے سلسلے میں ایک واضح راہِ عمل اختیار کرنے کے لئے ایک معیار کی ضرورت محسوس ہوئی اور انسان نے قانون یا اصول قائم کئے۔ پھر اس قانون یا راہِ عمل پر عمل کرانے کے

لئے ایک بالا دست قوت کی ضرورت محسوس ہوئی جو حکومت کے نام سے وجود میں آئی۔ اس کے بعد اس بالا دست طاقت کے فیصلے سے انحراف اور تصادم کو جرم کہا گیا اور اس کے مرتکب کو مجرم کہا گیا۔ تاہم اس سلسلے میں بعض معاشرتی اور مافوق العقل اقدار اور روایات کا تصور بھی روا رکھا گیا اور ان کے منکر اور منحرف کو بھی مجرم گردانا گیا۔

جرم کے معیار کے سلسلے میں اختلافات کو دخل رہا ہے اور اخلاقی اور مذہبی توضیحات کو نمایاں اہمیت حاصل رہی ہے۔ جہاں تک ہم تاریخ پر غور کرتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ منصف اور مقنن عموماً مذہبی مجالس فکر سے متعلق رہے ہیں اور ان کے فیصلوں اور قوانین جہاں مصالح ملکی اور حالات و واقعات کو دخل رہا ہے۔ وہاں ان کے مذہبی معتقدات کی گہری چھاپ بھی موجود ہے۔

جرم و سزا کے سلسلے میں مجرم کا کردار ابتدا ہی سے بڑا پیچیدہ رہا ہے اور ماہرین نفسیات کے مطالعے کا موضوع۔ مجرم کے ارتکاب جرم میں نہ صرف اس کی ذاتی مصالح، حالات کی مجبوریوں اور فطری جبلتوں کو دخل رہتا ہے۔ بلکہ اس کی لاشعوری پیچیدگیاں بھی اس کے جرم کا سبب بنتی ہیں۔ ان پیچیدگیوں کا وجود انسان کے اردگرد کے ماحول سے جنم لیتا ہے۔ اس ماحول میں ماں باپ، بہن بھائی، زمانہ، آب و ہوا، موسم کامیابیاں اور ناکامیاں، دوستی اور دشمنی داخل ہیں۔

اس موقعے پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب مجرم اپنی لاشعوری کمزوریوں کی وجہ سے جو ماحول کی پیداوار ہیں، جرم کرنے پر مجبور ہوتا ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اسے سزا دی جائے۔ اگر حکومت اپنا اخلاقی

فرض یعنی ایسے ماحول کی تخلیق جس میں ایک شخص صحیح طور پر ذہنی اور جسمانی نشوو نما پا سکے، نہیں پورا کر سکتی تو حکومت کا قانون غیر موثر ہو جاتا ہے۔ سقراط اس موقع پر اسی چیز کا قائل نظر آتا ہے کہ اگر حکومت اپنے فرائض پورے کر رہی ہے تو اس کا قانون موثر ہے، وگرنہ نہیں۔

جہاں تک سزا کا تعلق ہے، اس کے بارے میں مختلف ادوار میں مختلف نقطہ ہائے نظر رہے ہیں۔ ابتدائی انسان جو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے اپنے معاشرے کے افراد سے ملنے پر مجبور تھا، اس کے لئے یہ سزا بہت تکلیف دہ تھی کہ اسے اپنے قبیلے یا گروہ سے نکال دیا جائے۔ اس وقت اس کی حالت اس بھیڑ کی سی ہو جاتی جو اپنے گلے سے جدا ہو۔

جمہوریت کے اس ابتدائی دور میں منصف اور جج کا منصب تمام افراد کے مجموعے کو حاصل تھا۔ لیکن جوں جوں انسانی تہذیب پھلتی پھولتی گئی، توں توں مصروفیات بھی بڑھتی گئیں۔ اور لازماً مقننہ اور انتظامیہ کو ایک علیحدہ محکمہ اور شعبہ کی صورت میں رکھنا پڑا۔ باقاعدہ حکومتوں میں سزاؤں کی صورت بھی تبدیل ہو گئی۔ اب معاشرتی اور معاشی مقاطعہ کی بجائے جسمانی اور مالی ایذا رسانی کی سزائیں مروج ہو گئیں۔ دور متوسط (Middle Ages) میں ان سزاؤں میں اکثر بڑی کڑی اور سخت تھیں۔ خصوصاً شخصی حکومتوں میں۔ مثلاً سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں انگلستان میں دو سو چھوٹے چھوٹے جرائم ایسے تھے جن پر موت کی سزا دی جاتی تھی۔ مثلاً خرگوش مار لینا، ممنوعہ جگہ سے مچھلی پکڑنا وغیرہ۔ سزاؤں کی سختی زیادہ تر ان اوقات میں رہی جب عدلیہ پر مذہبی ذہن قابض ہوا۔

چنانچہ لیٹیمر، ریڈے، جون آف آرک اور دوسرے بہت سے مشہور لوگوں کو زندہ جلا دیا گیا۔

ابتدائی جمہوریت میں مجرم کو صفائی کا پورا اور مکمل حق حاصل تھا۔ چنانچہ ہم سقراط کو ایتھنز کے شہریوں کی مجلس میں اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ تاہم بہر صورت عدلیہ ہی کا اختیار تھا کہ اس صفائی کو تسلیم کرے یا نہ۔ دور متوسط میں خصوصاً شخصی حکومتوں میں مجرم کو حق صفائی ہرگز حاصل نہ تھا۔ ان کے ہاں صفائی پیش کرنے کا حق مانگنا بھی ایک علیحدہ جرم کی حیثیت رکھتا تھا۔ آج کے تہذیب یافتہ دور میں اگرچہ حق صفائی کو عموماً تسلیم کر لیا گیا ہے، تاہم یہ حق براہ راست نہیں ہے اس لئے یہ صفائی سے بڑھ کر لفاظی اور قانون کی الفاظ جنگ بن کر رہ گیا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ بڑے بڑے جرائم عہد عتیق سے اب تک مختلف حالات میں مختلف اسباب کے نتیجہ کے طور پر وجود میں آتے رہے ہیں۔ اور ان کی سزائیں بھی مختلف ہی ہیں۔ لیکن اگر ان جرائم کو جن کا تعلق قوانین ملکی سے ہے۔ نظر انداز کر کے عام سطح پر سوچیں تو بھی ہم ہر قسم کے جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ بات کی ابتدا معمولی ہوتی ہے مگر نتیجہ غیر معمولی۔ اور عموماً سبب، عزت کا حصول۔

ہندوستان میں "ناک" بہت مشہور ہے۔ وہ ناک یہی عزت ہے۔ اکثر سنا جاتا ہے کہ "ایسا کام نہ کرو جس سے تمہاری ناک کٹ جائے"۔ "میں مرتے مر جاؤں گا لیکن یہ کام کر کے اپنے خاندان کی ناک نہیں کٹنے دوں گا"۔ وغیرہ وغیرہ۔ تمام لڑائی جھگڑے اسی وجہ سے ہونے

ہیں کہ ایک آدمی نے کسی کو کسی بات پر فہمائش کر دی، یا اس کی عزت پر ہاتھ ڈال دیا۔ بس یہیں سے "بے عزتی" کا احساس ابھرا اور اتنا ابھرا کہ کئی کئی نسلوں تک اس کا اثر رہا۔ وقت، دولت، صلاحیتیں، زندگیاں، سب کچھ قربان ہوتا چلا گیا، مگر اپنی ہتک برداشت نہ ہو سکی۔ دنیا کی بڑی بڑی سازشیں اسی بدولت معرض وجود میں آئیں کہ سازش کا محرک عز و جاہ کے حصول کی خواہش میں اندھا ہو گیا یا کسی بات پر کسی کے خلاف ہو گیا۔ چنانچہ انتقام کی آندھیاں حرکت میں آ گئیں۔ پھر گھٹیا سے گھٹیا حربے بھی کام میں آ گئے اور انسانیت کی دھجیاں اڑ گئیں۔

اکثر لوگ پھوٹ ڈالنے میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ الف کو ب کی برائیاں گنا کر اس کے خلاف کر دیا۔ پھر ب کے سامنے الف کے کردار کی گھناؤنی تصویر پیش کی۔ اس طرح دونوں کو راز داں بنا کر دونوں کی کمزوریاں پا لیں اور پھر لگا بلیک میل کرنے۔ یہ صورت حال الف، ب دونوں کے لئے ہی نہیں، ان کے متعلقین کے لئے بھی بڑے سنگین نتائج کی حامل ہو سکتی ہے۔ میں نے کسی منچلے سے یہ کہانی سنی ہے کہ کانگرس کے ایک گروپ نے پچاس الزامات کی فہرست دوسرے گروپ کے متعلق تیار کر کے صدر کانگرس کو دی تو دوسرے گروپ نے "جواب آں غزل" کے طور پر پچھتر الزامات کی فہرست پہلے گروپ کے متعلق کر دی گئی۔ چونکہ پارٹی کے وقار کا سوال تھا۔ اس لئے صدر نے دونوں فہرستوں کو نذر آتش کر دیا۔ ورنہ پوری کانگرس کا پول کھل جانے کا اندیشہ تھا۔

---

# جوانی میں رہنمائی کی ضرورت

عالم شباب میں ایک نوجوان اکثر محسوس کرتا ہے۔ کہ اس کی زندگی بہت سے مسائل کا مرکب ہے ان میں بعض مسائل اس کے لیئے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان مسائل کے حل بعض اوقات اسے سوجھ جاتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو ایک بالغ نظر منطقی سے کم تر درجہ نہیں دیتا۔ لیکن میدان عمل میں اس کی تمام تر مساعی ان مسائل کے منطقی حل تو کجا سیدھے سادہ عام فہم حل بھی پیش نہیں کر سکتیں اور پھر وہ گریز کی راہ تلاش کرتا ہے۔

زندگی جو لامتناہی مسائل سے عبارت ہے۔ اس کا حل تلاش کر کے اسے کانٹوں کی راہ سے ہٹا کر پھولوں کی سیج تک لے جانے کے لیئے ہمیں اپنے ماحول کا فہم حاصل کرنا ضروری ہے۔ اور عنفوانِ شباب میں تجزیۂ نفس ہی مسائل زندگی کے افہام و تفہیم کی راہ کھولتا ہے۔ اور

اگر نوخیز یہ جان جائے کہ اسے زندگی کو کن زاویے ہائے نگاہ سے دیکھنا اور پھر مقصد کو عملی جامہ پہنانا ہے۔ تو اس کے بہت سے مسائل خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔ حضرت علیؓ کا قول ہے۔

"جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔"

میدان زندگی میں علم النفس کے بعد والدین کے رویے اور سلوک سے مطابقت رکھنا بھی زندگی کی راہ سے کانٹے ہٹانے میں ایک ستون سے کم اہمیت نہیں رکھتا۔

اب میں کوشش کروں گا کہ آپ کو والدین کے طرزِ فکر و سوچ سے آشنا کراؤں۔ تاکہ شباب کی رنگینیوں سے جائز حدود میں لطف اٹھانے کے لئے بزرگان کنبہ کے خیالات و افکار سے یکسانیت پیدا کرنے میں دقت محسوس نہ ہو۔ انسان بچپن کی بے فکر زندگی گذارنے کے بعد عالم شباب میں داخل ہوتا ہے۔ اب والدین اور اولاد کے تعلقات کی نوعیت تبدیل ہو جاتی ہے۔ پہلے والدین بچے کی پرداخت کے لئے اسے نہلانے، روٹی کھلانے، کپڑے پہنانے، مصائب و آلام سے محفوظ رکھنے اور حادثات سے دوچار ہونے غرضیکہ ہر میدان میں سہارا دیتے تھے۔ والدین اس کی خوشی اور غم میں اس کی راہنمائی کرتے تھے۔ بچے کی زندگی سے متعلقہ ہر قسم کے بڑے مسائل کا فیصلہ ان کا آخری فیصلہ ہوتا تھا۔ جوں جوں بچہ اپنی عمر کے دن۔ ماہ اور سال تبدیل کرتا چلا گیا اسی طرح والدین کا رویہ ان کی زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں تغیر پذیر ہوتا رہا والدین اور اولاد کی زندگی کا یہ دور،

تعلقات اور ذمہ داریوں کا ایک نیا باب کھولتا ہے۔ بچپن میں بچہ اپنے ماحول کے متعلق جان جاتا ہے۔ اور کائنات کی ہر تخلیق سے آشنائی حاصل کر لیتا ہے۔ اردگرد کے ماحول سے واقفیت کے بعد بھی بچہ آغازِ شباب میں ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے سے گھبراتا ہے۔

آغاز جوانی میں انسان کے افق میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے افکار و خیالات میں ایک نیا ولولہ اور نئی زندگی کی روح بیدار ہوتی ہے۔ دنیا کو وہ مسحور کن انداز سے دیکھتا ہے۔ اور کائنات کی رنگینیوں سے لطف حاصل کرنے کے لئے جد وجہد کرتا ہے اور اس کے لئے ایک آزاد و بے فکر ماحول کا متمنی ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کا یہ پہلو نہایت دلچسپ اور اہم ہے کیونکہ تجربات و مشاہدات کے لئے اسے قید و بند سے آزاد حالات کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس ضمن میں سب سے پہلی مشکل جو علومِ فطرت کے حصول اور باغِ دنیا سے خوشہ چینی میں حائل ہوتی ہے وہ آپ کے خاندان کا ایک تابع فرد ہونا ہے۔ بعض لوگ اس کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو گھریلو بندھنوں سے پہلی فرصت میں آزاد کرا لینا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنی خواہشات اور خیالات کو ایک آزاد دنیا میں بڑھنے اور پھیلنے کا موقع دیں۔ ہو سکتا ہے یہ خیال کسی حد تک درست ہو۔ لیکن حقیقتاً دنیا میں ایک نوجوان کا خاندان سے وابستہ رہنا اور والدین کی ہدایات و نصائح پر کاربند رہنا۔ اس کی زندگی کو ماحول سے مطابقت دینے کے لئے ناگزیر ہے۔ وہ اپنے درخشاں مستقبل کے لئے والدین کی راہنمائی کا اسی طرح مرہونِ منت ہے۔ جس طرح اس کے بچپن کا بے دست و پا

طفلی دور تھا۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارا خاندانی نظام ہی ہماری تہذیب و تمدن کا خالق ہے۔ خاندان کے ایک گروہ سے برادری کی تشکیل ہوتی ہے۔ اور پھر بہت سی برادریاں ایک قوم کو جنم دیتی ہیں۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ مذہبی تنظیم سے قوم کی فلاح و بہبود ممکن ہے۔ اور کسی قوم کے خیالات ہی اس کے مذہب کا موجب بنتے ہیں جن کی تعلیم مندروں گرجوں اور مسجدوں میں دی جاتی ہے۔ لیکن اس کا بھی اگر نظر عمیق سے تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کلیسا۔ مندر یا مسجد کی تعلیم کے خیالات اس قوم کے خاندانی حلقوں کے خیالات کا مفہوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان مذہبی درسگاہوں کی کامیابی کا انحصار بھی خاندانوں کے مذہبی خیالات پر مبنی ہے۔

خاندانی تنظیم میں سانس لیتے ہوئے والدین اپنے نزدیکی تعلقات کی بنا پر آپ کو آئندہ پر لطف اور با آرام زندگی گذارنے کے گر اچھی طرح ازبر کرا سکتے ہیں۔ اور آپ جب ایک علیحدہ گھر کے مالک ہوں اس وقت کی آپ کی ذمہ داریوں کے لئے والدین کی آغوش ہی ایک اعلےٰ درسگاہ ہو سکتی ہے۔ والدین ہی بچوں کو زندگی کی دوڑ کے لئے بہتر ایتھلیٹ بنا سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی اسی راستہ پر دوڑ چکے ہیں۔

والدین زندگی کی راہوں سے آشنا ہوتے ہیں۔ انہوں نے زندگی کے حادثات سے جنگ کی ہوتی ہے۔ ان کو ان تمام عناصر کی کماحقہٗ واقفیت ہے۔ جو ہماری زندگی کو ایک طرف مسرت و شادمانی کی بلندیوں تک لے جانے والے ہیں اور دوسری طرف ہمارے لئے مایوس کن اور پریشان کن حالات کا موجب بھی ہو سکتے ہیں۔ اس لئے بھی وہ ہماری راہنمائی کے لئے

موزوں ہیں۔ اور زندگی کے بہترین راہ شناس۔

نگاہ بلند سخن دلنواز۔ جان پر سوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

وہ نوجوان خوش قسمت ہیں جن کے والدین ان کی پھلتی پھولتی جوانی کے محافظ ونگہبان ہیں۔ اور خصوصاً ایسے والدین جو اپنی اولاد کو معاشرہ میں رہنے کی اقدار سے روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ ان کو لغزشوں سے دامن بچا کر صحیح راہ پر چلنا سکھاتے ہیں۔ اس عمر میں بچے والدین کے التفات کو کم سمجھتے ہیں حالانکہ والدین کی محبت بچوں کے لئے دوسروں کی نسبت زیادہ ہوتی ہے بعض اوقات ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب جوان آدمی والدین کی نسبت خود کو زیادہ عقلمند سمجھتا ہے۔ خصوصاً تربیتِ اولاد کے ضمن میں والدین کے کسی رویہ سے نالاں ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کی یہی کم عقلی ہے۔ کیونکہ بحیثیت والدین اس کی نظر ان کے مسائل کے حل تک نہیں پہنچ سکتی۔ ان اسرار و رموز کا حل اس وقت اس کی سمجھ میں آتا ہے جب وہ خود بچوں کا باپ ہوتا ہے۔ اور اس کی زندگی بحیثیت والد کے بچوں سے بندھ جاتی ہے۔

جب ہم زندگی کی دوڑ میں جائز کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں تو ہمارے والدین کی خوشی بے انتہا ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کی اپنی محنت کا پھل انہیں لذیذ اور شیریں ملتا ہے۔ وہ اپنی زندگیوں پر فخر کرتے ہیں۔ اور خود کو خوش قسمت انسان سمجھتے ہیں۔ لیکن جب حالات اس کے برعکس ہوتے ہیں۔ اور ہم اپنی زندگی کی نیا ایسے سمندر کی راہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ جہاں نعقن آب اور سمندری پانی کو صرف تلاطم سے ہی کام ہے۔ تو یقین جانیئے

کہ والدین کے لئے تلخی کا اس سے بڑھ کر اور کوئی درد نہیں ہوتا۔ وہ اپنے آپ کو بدبخت اور سیاہ کار سمجھتے ہیں۔ اپنی طویل زندگیوں کو بے سود اور بے کار خیال کرتے ہیں۔

جب آپ بچے ہوتے ہیں تو والدین کو مختار کل سمجھتے ہیں ان کے ہر فیصلے کو چیف جسٹس کے فیصلے سے کم خیال نہیں کرتے۔ اور ہر کام خواہ وہ مبہم ہی کیوں نہ ہو کرنا والدین کی عین خوشنودی سمجھتے ہیں۔ لیکن ارتقاء کی منازل میں ایک ایسا دور بھی آتا ہے۔ جب آپ میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ حالات کو سمجھنے کا فہم ہوتا ہے اور کام کو اپنے منتخب کردہ طریق پر کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہی کامرانی کا دور ہوتا ہے۔ لیکن آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ بچپن میں والدین کی خواہشات کے مطابق عمل نہ کرنا اور ان کو درخور اعتنا نہ سمجھنا آپ کے لئے حالات کو بد سے بدتر کر دیتا ہے۔

بلوغت کے اس دور میں داخلے کے ساتھ والدین سے تعلقات کی نوعیت میں تبدیلی آتی ہے۔ نوجوان زندگی کی اس نہج پر پہنچنے کے بعد معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ اپنے فیصلے کو افضل اور فہم و ادراک کی حس کو اپنے اند دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ سمجھتے ہیں۔ اور مواقع کو اپنی میلانِ طبع کی ڈگر پر چلانے کی کوشش کرتے ہیں ان میں یقین و اعتماد کی ایسی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ جو انہیں گھریلو بندشوں سے آزاد کروانے میں ممدو معاون ہوتی ہے۔ بعض اوقات ان بندشوں کی وجہ سے نوجوان کا پیمانہ صبر لبریز بھی ہو جاتا ہے۔ اور وہ والدین کی اس مسلسل نگرانی سے جلدی چھٹکارے کی راہ تلاش کر لینا چاہتے ہیں۔ ان کو خواہش ہوتی ہے کہ نقل و حرکت سے پابندیاں اٹھالی جائیں۔ اور وہ اپنی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے میں آزاد ہوں۔

بلوغت کا کوئی دن مقرر نہیں - یہ ضروری نہیں کہ اکیس سالہ نوجوان جس دن اکیس سال کا ہوگا وہ بالغ ہوگا۔ اور اکیس سال سے ایک دن قبل نابالغ۔ کیونکہ سن بلوغت میں ایک دن کی کمی ہے - اکیس سال پورے کرنے کے بعد آپ کا سن بلوغت کے لئے قانونی جواز تو ہو سکتا ہے - لیکن اس کے برعکس آپ کے بچپن اور بلوغت کے سالوں کے درمیان اور مسائل حائل ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے - اس سن میں آپ کو والدین کی طرف سے ذمہ داریاں سونپ دی جاتی ہیں -

ایام جوانی میں والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے جلد از جلد اپنے فرائض سے آشنا ہوں اور ذمہ داریوں کو قبول کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر لیں - انہیں اس پر فخر ہوتا ہے کہ آپ اپنی قابلیت بڑھا رہے ہیں - اس دوران میں والدین بچوں کے لئے راہنما کا کام دیتے ہیں - اور انہیں آشوب زمانہ سے پناہ دینے کی بجائے انہیں ان حالات سے مردانہ وار مقابلہ کے لئے تیار کرتے ہیں۔

بچپن اور بلوغت کے درمیانی ایام میں والدین بچوں پر آہستہ آہستہ ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالتے چلے جاتے ہیں اس کے لئے بچوں کے لئے لازمی ہے کہ وہ اندازۂ عمر کے لحاظ سے زیادہ اپنی قابلیت اور سمجھ بوجھ سے کام لیں بچوں کو اپنی عمر کے پندرہ یا سولہ سال گننے کی بجائے حالات کو سمجھنے اور ان سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

بالغوں کو ذمہ داریاں سونپتے وقت والدین کے لئے واجب ہے کہ اس معاملہ میں حد اعتدال کو ملحوظِ خاطر رکھیں اور ہر دو فریق اپنے معاملہ میں سوجھ بوجھ سے کام لیں۔

والدین بچوں پر وزن ایک خاص پروگرام کے مطابق ڈالیں تاکہ بچے بیس سال کی عمر تک تمام تر ذمہ داریوں کو کماحقہٗ اور ترتیب سے اٹھالیں اور فرائض کی ادائیگی میں تساہل سے کام نہ لیں اور ذمہ داریوں سے بیگانگی کا اظہار نہ کریں۔

بچے والدین کے متعلق خیال کرتے ہیں کہ وہ انہیں فرائض سونپنے میں دھیمی چال چل رہے ہیں۔ لیکن آپ کو بے صبر نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ بعض وقت وہ بادل نخواستہ یہ محسوس کرتے نظر آتے ہیں۔ کہ اب تم حالات سے نپٹنے کے لیئے تیار رہو۔ بعض اوقات والدین بچوں پر ذمہ داری کا بوجھ جلدی ڈال دیتے ہیں حالانکہ وہ اس احساس سے نابلد ہوتے ہیں اسی طرح بعض بے صبر بچے والدین کو محدود النظر خیال کرتے ہیں۔

والدین کا سپردگیٔ فرائض کا فعل بعض اوقات بچوں کے لیئے اضطراب کا باعث ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس عمر میں بچوں کی آراء لوگوں کو متوجہ کر لیتی ہیں۔ اس اضطرابی کیفیت کا دوسرا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ کتنے دوسرے لوگ آپ کو پہلے ہی بالغ تسلیم کرتے ہیں لیکن والدین فرائض سونپنے میں تساہل سے کام لے رہے ہوتے ہیں۔ جس سے آپ کے شبہات بڑھ جاتے ہیں کہ شائد والدین کو ہمارے بالغ پن کے متعلق ابھی شک ہے۔

جلد ہی معاملہ فہمی اور عقل سے آپ کے شبہات ختم ہو جائیں گے۔ اور کوتاہ نظری دور ہو جائے گی لیکن اس کے خاتمہ اور اپنے حقوق کے حصول کی خاطر آپ کو جذبات کا اظہار شریفانہ طریق اور اعتدال سے کرنا چاہیئے۔

آپ کا ذہن آپ کو غلط راستہ دکھا رہا ہے کہ والدین آپ کو ذمہ دار بنانے میں تنگ نظری سے کام لے رہے ہیں۔ اور ان کے

فعل میں تساہل اس کا بین ثبوت ہے لیکن حالات اتنے ناخوشگوار نہیں ہوتے جتنا انہیں سمجھا جاتا ہے یہ دلچسپ امر ہے کہ آپ اگر اپنے ماضی پر ایک طائرانہ نگاہ ہی ڈالیں تو بہت سے معاملات آپ کو یاد آئیں گے جن کے ... بارے میں آپ کا فیصلہ کتنا مضحکہ خیز تھا۔ آپ کے حالیہ تجربات آپ کی خام عقلی کی گواہی اکثر آپ کو دیتے ہوں گے۔

اس عمر کے بچوں کے لئے والدین کو اس مسئلہ سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے کہ بعض وقت ان کا بچہ ایک چیز کی خواہش کرتا ہے لیکن والدین کی مرضی اس کے خلاف ہوتی ہے۔ نوجوان کو پختہ ذہن ہونے تک کئی مراحل سے گزرنے ہوتے ہیں۔ ہر مرحلہ پر اس کی خواہشات کی نوعیت مختلف ہوتی جاتی ہے۔ ایک مرحلہ پر وہ ایک خواہش کا صرف اظہار ہی کرتا ہے۔ لیکن کسی دوسرے مرحلہ پر وہ اس کو اپنی عزت کا مسئلہ بنا لیتا ہے۔ اور تمام ترتوتیں اس کے حصول کی خاطر صرف کر دیتا ہے۔ اس کی مثال اس طرح پیش کی جا سکتی ہے۔ کہ آپ ایک موٹر سائیکل کی خواہش عمر کے ایک مرحلہ پر کرتے ہیں لیکن دوسرے مرحلہ پر یہی آپ کے لئے اہم کام بن جاتا ہے۔ اس کے حصول کے لئے کئی حالات پیدا ہو سکتے ہیں مثلاً آپ والدین کی اجازت حاصل کرتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے آپ کی مالی مشکلات اس کے حصول میں آڑے آئیں۔ قطع نظر ان تمام مشکلات کے ایک وقت ضرور آئے گا جب آپ تکمیلِ خواہش کے بعد اس میں کوئی دلچسپی نہ پائیں گے۔

جب آپ بالغ ہو جاتے ہیں۔ تو بلوغت کے اظہار اور اس کی تائید کے لئے کئی کام کرتے ہیں۔ مثلاً آپ بہترین سوٹ موسم سرما میں

پہنتے ہیں تاکہ لوگ آپ کو دیکھ کر داد دیں - آپ اپنے والد کی نسبت زیادہ تیز رفتاری سے کار چلائیں گے - سڑک پر جہاں آپ کو ٹریفک کا سپاہی کھڑا کرے زیادہ فخر سے اکڑ کر کار میں یا بائیسکل پر بیٹھیں گے - ہارن زیادہ زور سے اور دیر تک بجانے کی کوشش کریں گے - بالوں کو ایک خاص انداز سے ترچھاؤ گے - علی ہذا القیاس روزمرہ کے معاملات میں اکثر ایسی مثالیں دی جا سکتی ہیں - جن سے آپ اپنی بڑائی کی تائید لوگوں سے چاہتے ہیں - مجھے یہ واقعہ یاد آیا ہے جو اپنے اندر بڑی وزنی دلیل رکھتا ہے - میرے ایک دوست سکول ٹیچر ہیں اور قصبہ کے ہائی سکول میں سپورٹس انچارج بھی ہیں - قصبہ میں دو ہائی سکول ہیں - ان کا سکول ہر سال سکولز ٹورنامنٹ میں حصہ لیتا ہے اور ہر سال دو تین کھیلوں میں نمایاں کامیابی حاصل کر لیتا ہے - اب جب یہ میرے دوست کھلاڑیوں کے ساتھ اسٹیشن پر گاڑی سے اترتے ہیں تو فلک شگاف نعروں سے اہل دیہہ کی سکون و اطمینان میں ایک طوفان برپا کر دیتے ہیں - میرے اس دوست کی قیادت میں، یہ بے پناہ ہجوم ایک جلوس کی شکل میں شہر کی گلیوں سے نعرے لگاتا اور شور مچاتا ہوا گزر جاتا ہے - مخالف سکول جس نے اپنی کبھی کوئی ٹیم ٹورنامنٹ میں حصہ لینے کے لئے نہیں بھیجی ان سے یہ صاحب اپنی قابلیت اور کھلاڑیوں کی ٹریننگ کے سلسلہ میں برتری کی تائید لینا چاہتے ہیں - جسے دوسرے الفاظ میں حسن کارکردگی یا بلوغت کے معنی بھی دیئے جا سکتے ہیں دوسرے لوگوں پر ظاہر کرنے کا طریق یہ شور و غوغا ہے -

ایک عام ذہن کا نوجوان لڑکا بھی یہ خواہش رکھتا ہے کہ وہ اپنے والدین کی عائد کردہ حدود سے بے نیاز ہو کر جہاں اس کی مرضی

ہو جائے ۔ اس کو اس بات کا پختہ یقین ہے ۔ کہ وہ ہر محفل اور زندگی کے ہر موڑ پر اپنے آپ کو کامیاب و کامران ثابت کرے گا کیونکہ ان حالات کے مطابق اس نے تمام صلاحیتیں اپنے اندر یکجا کی ہیں ۔ لیکن آپ کے نظریہ کے تحت والدین اس کے راستہ میں حائل ہونا چاہتے ہیں ۔ اور اس نادر موقع سے فائدہ اٹھانے کی راہ میں روڑا ہیں ۔

لیکن اگر ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور کیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں ۔ کہ کیا آپ کے والدین آپ کو شتر بے مہار پھرنے سے اس لئے منع کر رہے ہیں کہ وہ آپ کو ناخوش رکھنا چاہتے ہیں ؟ کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ وہ آپ کی ایک معمولی خوشی کے حصول میں اس لئے حائل ہو رہے ہیں کہ وہ کام بجائے آپ کی مرضی کے اپنی مرضی کے مطابق کر لینا چاہتے ہیں ۔ کیا آپ خیال کرتے ہیں ۔ کہ وہ ابھی تک آپ کے افسر ہیں ۔ یا اس بات پر تلے ہوئے ہیں ۔ کہ وہ آپ کو یہ احساس دلا دیں کہ آپ کی ابھی قانونی بالغ عمر پوری نہیں ہوئی ۔ ایسا کبھی بھی نہیں ہو سکتا ۔ بلکہ اصل واقعات اس کے بالکل الٹ ہیں آپ کے والدین کی کبھی یہ مرضی نہیں ہو سکتی کہ وہ آپ کی خواہشات کو پامال دیکھنا چاہتے ہیں ۔ بلکہ ان کی خواہشات اس سے بالاتر ہیں ۔ وہ آپ کو زندگی میں کامیاب و کامران دیکھنا پسند کرتے ہیں ۔ اور ان کا ذہن ہر وقت اس طرف رہتا ہے ۔ کہ اس طریق پر آپ کو چلایا جائے جس پر چل کر آپ زیادہ سے زیادہ خوشیاں حاصل کر سکیں اور آپ کا مستقبل درخشاں ہو ۔

آپ شائد یہ حجت پیش کریں ۔ کہ والدین بچوں کے ساتھ ایسا سلوک اس لئے کرتے ہیں ۔ کیونکہ بالکل اسی عمر میں ان کے ساتھ بھی ایسا ہی

سلوک ہوا تھا۔ یہ جواز ٹھیک ہے۔ لیکن ہمارا مدعا بھی یہی ہے۔ کہ والدین کو اس عمر میں ان باتوں سے روکا گیا تھا۔ اور اسی تجربہ کی بنا پر وہ والدین اپنے بچوں کو درس دے کر ان کی زندگیوں میں مسرت و شادمانی کا زیادہ رنگ بھرنا چاہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک اچھا معلم اپنے متعلم سے اپنے حالات زندگی کا تذکرہ کرتا ہے اور اسے اچھی باتوں کی ہدایت کرتا ہے۔

اس بات کا انکشاف آپ کے لئے تکلیف دہ ہوتا ہے کہ آپ کی قوت فیصلہ پر بھروسہ نہیں کیا جاتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے بلوغت کی منزل تک کئی مراحل طے کئے ہیں۔ اور اس میدان میں کافی تجربات حاصل کئے ہیں۔ اور معاملات فہمی کے لئے کافی استعداد حاصل کر چکے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی معاملہ فہمی یا بصیرت سے کسی معاملہ پر غور و خوض کر کے نتائج اخذ کرنا نہیں مشکل ہے۔ کیونکہ قوت فیصلہ صرف تجربات سے حاصل کی جاتی ہے۔ دنیا میں شائد کوئی آدمی بھی قوتِ فیصلہ میں حرفِ آخر کی حیثیت نہیں رکھتا ہے۔ لیکن ایک نوجوان جس کی تربیت طبعی حالات میں ہو رہی ہے زندگی کے ہر سال میں بصیرت کا ایک نیا باب کھولتا ہے۔

آپ زندگی کے گذشتہ دو سال کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان دو سالوں میں آپ نے بہت سی غلطیاں کیں۔ یہ دو سالہ مدت آپ کو مختصر سا عرصہ نظر آئے گا۔ ان دو سالوں میں جو غلطی آپ نے کی اسے آپ ایک واقعہ ہی کہیں گے اور آپ کے طرزِ تکلم سے کبھی نابالغ ہونے کا شبہ نہ ہوتا ہوگا۔

جن دو سالوں کا آپ کے ذہن پر ایک دھندلا سا تصور باقی ہے۔ اگلے دو سالوں میں ان کے متعلق آپ کا زاویۂ نگاہ مختلف ہوگا۔ اس کے بعد دو سال آپ میں گذشتہ دو سالوں سے زیادہ بصیرت اور پختگی پیدا کریں گے۔ لیکن پھر بھی آپ کی ان صلاحیتوں کو پختگیٔ عمر کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ یہ باتیں آپ کی اس عمر سے متوقع ضرور تھیں، یہ آپ کے لیئے نہایت خوشگوار حالات پیدا کر سکتا ہے۔ جب آپ اپنی قوت فیصلہ کو جائز حدود تک استعمال کرنا سیکھ لیں گے۔ آپ یہاں ایک سوال کر سکتے ہیں کہ کیا ایک آدمی کو صرف اسی فارمولہ پر عمل پیرا ہونے کے لیئے کئی ماہ و سال بلوغت کا انتظار کرنا ہوگا۔ اور اگر کیفیت یہی رہی تو پھر ظاہر ہے کہ ایک زندگی کے مراحل کو کامیابی کے ساتھ تیزی سے طے کرنے والا ایک بے کیف زندگی گذارنے پر مجبور ہوگا۔ میں اس مرحلہ پر اس بات پر بحث کرنا نہیں چاہتا کہ آپ کو بے کار پڑے رہنا چاہیئے اور اپنی زندگی کے بھرپور مسرتوں کے دور کو یونہی بے کار گذار دیں۔ ہاں میں آپ کو یہاں صرف یہ مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ کہ آپ اب پھر اپنے والدین کی ہمدردانہ پند و نصائح کو مشعلِ راہ بنائیں گے تو تبھی زندگی کے پر خار راہوں سے کامیاب گذر سکتے ہیں۔ کچھ نوجوان شکایت کرتے ہیں کہ والدین ان پر بھروسہ نہیں کرتے بلکہ انہیں کسی کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیئے اجازت نہیں دیتے۔

اگر بعینہٖ حالات ایسے ہیں۔ کہ والدین آپ کو میدان عمل میں تنہا جد وجہد کرنے سے روکتے ہیں تو آپ کو سمجھ لینا چاہیئے کہ آپ کا طرز زندگی ٹھیک نہیں اور اسی لیئے وہ آپ کی سوچ بچار اور بصیرت پر اعتماد

کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ حالات ایسے ہی ہیں تو آپ کو زیادہ جانفشانی سے اپنے مقصد کے لیئے کام کرنا چاہیئے تا کہ والدین کا اعتماد جیت سکو۔ اگر آپ کے والدین معیاری ہیں۔ تو وہ آپ پر بھروسہ کر کے خوش ہوں گے لیکن یہ صورت صرف اسی وقت متوقع ہے جب آپ اپنے اندر ایسی صلاحیت پیدا کریں گے۔ اس کام کے لیئے خود کو مشکلات کے جال میں مت پھنسائیے بلکہ صرف وہی فرائض اپنے ذمہ لیں جو آپ کما حقہ سر انجام دے سکتے ہیں۔ صرف انہی معاملات کا فیصلہ اپنے ذمہ لیں جن کے متعلق آپ کی ادراک کی حس کام کر سکے۔ اپنے والدین کو کہیں کہ وہ بتدریج آپ کی صلاحیت کا امتحان لیں اور اس کی جانچ کے لیئے چھوٹی ذمہ داریوں سے بڑی تک پیشقدمی کریں۔

والدین کا اعتماد حاصل کرنے کے لیئے آپ کو گھر میں اپنے کردار اور چال چلن سے ثابت کرنا ہوگا۔ کہ آپ ان کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ صرف وہی آپ کے مشیرِ زندگی ہیں اور کاکلِ گیتی کو سنوارنے میں ان کی مدد آپ کے لیئے ناگریز ہے۔

والدین کی تعظیم و تکریم کے لیئے کسی خاص اہتمام کی بھی ضرورت نہیں۔ بلکہ صرف چند معمولی اور سطحی قسم کے طریق سے اس کو ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ آپ کوئی کام کرنا چاہتے ہیں جس میں آپ کی ذاتی منفعت ہے۔ بہ بہتر ہوگا کہ آپ حکمتِ عملی سے والدین کی حضوری میں گذارشات پیش کریں۔ مثلاً "آپ سیدھا والدین سے کہتے ہیں کہ میں سکول چھوڑ کر مل میں کام کروں گا"۔ اس طرح کا بے التفاتانہ رویہ آپ کے والدین کے جذبات کے لیئے چیلنج ہوگا وہ آپ کے اس اقدام سے غلط تصور لے کر آپ کی بصیرت

کو ناقص اور آپ کو کم معاملہ فہم سمجھیں گے۔ آپ کے لئے بہتر تھا اس کو یوں ادا کرتے "مجھے عملی تجربہ کی ضرورت ہے۔ میں سکول کی چار دیواری میں کئی سال نظریات کے چکر میں رہا ہوں۔ اب میرے لئے عقلمندی ہو گی کہ سکول سے باہر ایک سال کے لئے مل میں پیش کردہ ملازمت کو قبول کر لوں۔ آپ کی اس تجویز کے متعلق کیا رائے ہے؟" مؤخرالذکر طرزِ تکلم آپ کے والدین کے لئے زیادہ تسلی بخش ہو گا۔ اور وہ کہیں گے کہ آپ کے دل میں ان کے لئے اب بھی عزت و احترام موجود ہے۔ اور آپ آج بھی ان کے مشورہ اور راہنمائی کو مشعلِ راہ بنانا چاہتے ہیں۔

آپ کے والدین آپ کے بہترین دوست ہیں۔ اگر آپ ان کی تعظیم و تکریم کریں گے۔ تو ایک خوشگوار زندگی کے مالک ہوں گے۔ اگر آپ اچھے طریق سے ان کے ساتھ تعاون کریں گے تو وہ اپنے تجربات سے آپ کی شخصیت کی تشکیل کے لئے زیادہ جلدی ترقی کے سامان فراہم کریں گے۔

# بڑا آدمی

عظمت کسی کی میراث نہیں ہوتی ۔ اولوالعزم اور بلند خیال افراد جب اعلےٰ مقاصد کی تکمیل کے لئے کمر ہمت باندھ لیتے ہیں تو عظمتیں خود ان کے قدموں میں آگرتی ہیں ۔ ان کی ہمہ گیر جدوجہد نئی نئی منزلوں کا پتہ دیتی ہے اور نئے نئے راستوں کا شعور ۔ شکستیں ان کے پائے ثبات کو متزلزل نہیں کر سکتیں ۔ ناکامیاں ان کے راستوں میں چراغ تو بن سکتی ہیں لیکن دیوار نہیں بن سکتیں ۔ زندگی میں حائل ہونے والی ہر مشکل ان کے لئے سبق آموز حیثیت رکھتی ہے ۔ وہ ادب، خدمت، دوستی اور عجز جیسی خوبیاں کسی سے توقع رکھنے کی بجائے خود کسی کو پیش کرتے ہیں ۔ ان کا مکتب طوفان حوادث ہے ۔ وہ بھنور میں بھی ہوں تو یاس کو قریب تک نہیں بھٹکنے دیتے اور ذہن میں منفی خیالات کی آماجگاہ کی پرورش نہیں کرتے ۔ ○

ایسے لوگ جنگ میں ہوں تو فتح کا تصور پہلے اور شکست کا خیال بعد میں لاتے ہیں۔ تاکہ یہ احساس انہیں ایک پختہ ارادے کی تکمیل میں اور منزل تک پہنچنے میں مدد دے۔ ان کے ارادوں کے سامنے آفت ناگہانی بھی حقیر بن جاتی ہے۔ سخی ہوتے ہیں لیکن شہرت، ہر دلعزیزی اور ذاتی مفادات کو سامنے رکھ کر نہیں، خوشنودی حق اور ادائیگی حق کی خاطر۔ ہر دلعزیز ہوتے ہیں لیکن رسمی نہیں۔ اگر عابد ہوتے ہیں تو برائے عبادت۔ اگر مالدار اور بڑے درجے کے طبیب بھی ہوں تو علاج کے وقت شہنشاہ اور غریب جس کے پاس سرمایۂ بے سامانی اور جامۂ عریانی کے سوا کچھ نہیں ہوتا، دونوں سے یکساں سلوک کرتے ہیں۔ وہ مخدوم ہوتے ہیں لیکن خدمت کرنے کے بعد۔ وہ معزز مہمان ہوتے ہیں لیکن خاکساری کے بعد۔ عالم ہوتے ہیں تو عاجز ہوتے ہیں۔ درویش ہوں تو منبع قناعت ہوتے ہیں۔ صوفی ہوں تو طہارت باطن کے لئے۔ عامل ہوں تو عالم ہونے کے باعث۔ نمازی ہوں تو تسکین قلب کے لئے۔ دعاگو ہوتے ہیں لیکن قلب سلیم کے لئے۔ کسی دنیوی حاجت کے لئے نہیں۔ استاد ہوں تو درس انسانیت اور سبق آدمیت سکھاتے ہیں۔ بڑے ہوں تو شفقت فطری رکھتے ہیں۔ متقی بننے کے لئے ایمان بالغیب اور رضائے خداوندی کو مشعلِ راہ بناتے ہیں۔ اور قدرتی اوامر و نواہی کی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ عاشق بنتے ہیں لیکن صابر بن کر۔ مستقل مزاج اور عادل بن کر۔ لیڈر ہوں تو مصلح اور مفکر ہوتے ہیں۔ محسن بنتے ہیں تو گھر لٹا کر۔ مردم آزار نہیں ہوتے۔ لالچی، مکار، مصلحت کوش اور ڈرپوک نہیں ہوتے۔ ان کا حج اس میں ہے کہ کسی کے دل کو خوش رکھیں۔

دل رکھتے ہیں لیکن دوسروں کے لئے - جیتے ہیں تو دوسروں کے لئے - مرتے ہیں تو دوسروں کے لئے -

اگر بڑا ہونے کے معیار پر ان لوگوں کو پرکھا جائے جو بڑے کہلاتے ہیں تو اکثر کا پول کھل جاتا ہے - اور محدودے چند اشخاص ایسے بچتے ہیں جو کسوٹی پر پورے اترتے ہوں -

ہندوستان نے سیاستدان بھی پیدا کئے ہیں اور راہنما بھی - رند بھی اور صوفی بھی - عارف باللہ بھی اور فنا فی العلوم بھی - مصلح بھی اور مفسد بھی - ایسے لوگوں کی فہرست اگرچہ زیادہ طویل نہیں لیکن اتنی ضرور ہے کہ ہم اس پر ناز کر سکیں - مگر وہ جس میں ان تمام خوبیوں کو یکجا دیکھ سکیں، صرف سر سید احمد خاں ہی کی شخصیت ہے -

سر سید کو بڑا آدمی کہنے میں ان کی ہمہ گیر شخصیت، بصیرت، فہم و فراست، علمیت، رہنمائیت، گوناگوں اوصاف اور حسن تدبیر کے پیش نظر ہر لحاظ سے حق بجانب ہیں - اس "بڑے آدمی" نے زندگی طوفانوں سے کھیلتے ہوئے گزاری، اور جن آندھیوں سے ٹکراتے ہوئے بسر کی، وہ اسی کا کام تھا - اور اگر سر سید نہ ہوتے تو شاید آج برصغیر ہندوپاک میں بسنے والے مسلمانوں کی تاریخ مختلف ہوتی -

سر سید احمد خان ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دلی میں پیدا ہوئے - باپ کی طرف سے سلسلہ نسب چھتیسویں پشت پر رسول اکرمؐ سے جا ملتا ہے - ان کے والد میر تقی بہت آزاد طبیعت کے مالک تھے ان کی والدہ خواجہ

فرید کی بڑی لڑکی تھیں۔

قرآن پڑھنے کے بعد فارسی و عربی کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد نواب زین العابدین سے ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔ پھر آلاتِ رسد کا مطالعہ کیا اور اس کے بعد طب پڑھنی شروع کی۔

جوانی زندہ دلی اور رنگین صحبتوں میں گزری خود لکھتے ہیں۔

"جوانی میں ہم ایسی گہری نیند سوتے تھے کہ فرشتوں کے اٹھائے بھی نہ اٹھتے تھے کیا کیا خیالات ہماری قوم کے ہیں جو ہم میں نہ تھے اور کونسی کالی گھٹائیں ہماری قوم پر چھا رہی ہیں جو ہم پر چھائی ہوئی نہ تھیں جب رند تھے تو فرہاد سے بڑھ کر تھے جب زاہد خشک تھے تو نہایت اکھڑ تھے جو صوفی تھے تو رومیؔ سے برتر تھے اب خاکسار ہیں اور اپنی قوم کے غمخوار"۔

سر سید نے ملازمت کی ابتدا صدر امین کے طور پر کی پھر ۱۸۴۱ء میں منصفی کا امتحان پاس کر کے منصف مقرر اور ملازمت کے سلسلے میں دہلی۔ بجنور۔ مراد آباد۔ غازی پور۔ علیگڑھ اور بنارس میں مقیم رہے۔ جولائی ۱۸۷۶ء کے تاخیر میں پنشن لے کر علی گڑھ آ گئے اور اپنی زندگی کے باقی بائیس سال اپنے ارادوں کی تکمیل میں گزار دیئے۔

سر سید نے اپنی تمام زندگی ہندوستان کے مسلمانوں کی ترقی میں وقف کر دی اور قول و فعل سے اپنی قوم کی ہر طرح سے مدد کی۔

ان کی تصانیف بے انتہا ہیں۔ ان کی مذہبی اور قومی خدمات کو شمار کرنا بہت مشکل ہے سرہ میں بہادر شاہ ظفر نے جواد الدولہ عارف جنگ کا خطاب دیا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں سر سید نے بے انتہا مصائب

اٹھائے اور ہر طرح سے حکومت کا ساتھ دیا۔ بجنور کے ہزار مسلمان جنہوں نے غدر میں حصہ لیا تھا۔ سر سید ہی کی کوششوں سے حکومت کے انتقام سے محفوظ رہے۔

۱۸۵۹ء میں انہوں نے یہاں ایک فارسی مدرسہ قائم کیا اور اسی سال ایک رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھکر بڑی جرأت سے گورنمنٹ کو پیش کر دیا۔ جس سے گورنمنٹ کے دل سے مسلمانوں کی رنجشیں کم ہو گئیں۔ ۱۸۶۰ء میں سر سید نے مراد آباد میں قحط کا انتظام اس خوبی سے کیا کہ بقول ان کے ایک دوست کے اُن کی تمام شہرت کا دارو مدار قحط کے موقع کی بھلائی و نیکی اور حسن انتظام پر ہے۔ غازی پور میں جاکر اس قوم کے ہمدرد نے ہندوستانیوں کو صحیح تعلیم سے روشناس کرا کے ترقی کے مواقع بہم پہنچانے کی خاطر ایک سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی ۱۸۶۴ء میں ایک مدرسہ غازی پور میں قائم کیا پھر علیگڑھ آکر ۱۸۶۶ء میں انہوں نے علیگڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔ اسی سال علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے ایک اخبار نکالا۔ جس کے ذریعہ سے انہوں نے ہندوستان کی بے انتہا خدمات انجام دیں۔ یہ اخبار کئی قسم کی مجبوریوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ تمام عمر نکالتے رہے۔

۱۸۶۷ء میں انہوں نے ورنیکلر یونیورسٹی کے لئے تحریک کی اسی سال ہومیو پیتھک علاج سے ہندوستانیوں کو روشناس کرایا۔ اردو زبان اور فارسی خط کی حمایت میں بے انتہا کوششیں کیں اور مرتے دم تک ان کی حمایت کرتے رہے۔

یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو وہ بنارس سے انگلستان روانہ ہو گئے۔ یورپ

سترہ ماہ ہندوستان میں قیام کیا اور دن رات ہندوستانیوں کی بھلائی کی کوشش کرتے رہے۔ ۱۶ اگست ۱۸۶۹ء کو ایس۔ سی۔ ایس آئی کا خطاب اور تمغہ عطا ہوا۔ ۲۰ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو سرسید انگلستان سے بمبئی واپس پہنچے۔ یہاں پہنچتے ہی انہوں نے اس کارِ عظیم کی بنیاد ڈالی جس کے لئے انہوں نے یہ سفر اختیار کیا تھا۔

۱۸۷۰ء میں انہوں نے رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ اس رسالے کی بے انتہا مخالفت کی گئی۔ سرسید پر کفر کے فتوے لگائے گئے۔ اُن کو ہر طرح سے اس رسالے کو بند کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اُن کو ڈرایا۔ دھمکایا گیا۔ مگر یہ اللہ کا شیر جس کام کا بیڑا اٹھا چکا تھا اُس کو انجام تک پہنچانے میں منہمک رہا اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کی۔ ایسے ہی شخصوں سے متاثر ہو کر علامہ اقبال کہہ گئے ہیں۔

؎ آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

۱۸۷۰ء میں اس مردِ مجاہد نے "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان ہند" قائم کی۔ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو ایم۔ اے۔ او اسکول کی بنیاد رکھی گئی اور پھر کوشش بسیار کے بعد ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن کے ہاتھوں علیگڑھ کالج کا افتتاح ہوا۔ اس کالج کو چلانے کے لئے سرسید کو بے انتہا مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ لوگوں کی مخالفت، روپے کی کمی، مسلمانوں کی جہالت و کم عقلی نے سرسید کو ہر طرح سے ناکام کرنا چاہا مگر وہ مردِ مجاہد قوم کا ہمدرد اپنے مقصد کے حصول کے لئے اپنے حادثات کی پرواہ کئے بغیر، خطرات کو خاطر میں لائے بغیر، لوگوں کی لعنت و ملامت اور طعن و تشنیع کو گوارہ کرتے ہوئے اور لوگوں کی جہالت

بہ کڑھتے ہوئے اپنے کام میں مصروف رہا۔ اُس نے کسی کی پرواہ نہ کی۔ اُس نے کسی قسم کا بُرا نہ مانا۔ اس نے اپنی قوم کی ہمدردی سے منہ نہ موڑا وہ مسلسل قوم کی خدمت کرتا رہا۔ قوم اس کو جھٹلاتی رہی قوم اس پر لعنت ملامت کرتی رہی۔ قوم اس کے کارناموں کا مذاق اڑاتی رہی۔ اور وہ قوم کو شکستہ سفینے کے بحرِ جہالت سے باہر نکالنے کی کوشش میں لگا رہا۔ قوم اُس کی باتوں کو سنی اَن سنی کرتی رہی اور وہ چیختا رہا وہ بولتا رہا۔

کون ہے جو آج مجھ کو اس سٹیج پر دیکھ حیران ہوگا۔ وہ جن کے دل میں قوم کا درد نہیں ہے وہی جن کا دل جھوٹ شیخی اور جھوٹی شخصیت سے بھرا ہوا ہے۔ آہ! اس قوم پر شرمناک باتوں کو شیخی اور افتخار کا باعث سمجھیں اور جو کام قوم اور انسان کی بھلائی کے لئے نیک نیتی سے کئے جائیں۔ اُن کو بے عزتی کے نام سے تعبیر کریں۔ وائے اُس قوم پر جو لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے مکر و پندار کے کالے سوت سے بنے ہوئے تقدس کے برقع کو اپنے منہ پر ڈالے ہوئے ہوں اور اپنی بدصورتی اور دل کی برائی کا کچھ علاج نہ سوچیں۔ افسوس ہے اُن لوگوں پر جو اپنی قوم کو ذلت اور نکبت کے سمندر میں ڈوبتا ہوا دیکھیں اور خود کنارے پر بیٹھ کر ہنستے رہیں افسوس ہے ان افراد پر جو قوم کی بھلائی کے کام کو شرم و نفرین کا کام سمجھیں..... الخ (حیاتِ جاوید ص ۱۳۳) ۔ کالج کے لئے انہوں نے بڑے لمبے لمبے سفر کئے۔ پٹنہ، گورکھپور۔ الہ آباد۔ مرزاپور۔ لاہور۔ امرتسر۔ پٹیالہ۔ حیدرآباد۔ نیل گری۔ بھوپال۔ جبل پور، غرض کہ ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں وہ مدرسہ کی دھن میں گئے اور آخرکار اس محسن قوم نے اپنے مقاصد کو

تکمیل تک پہنچا دیا۔

۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کی رات کے دس بجے قوم کا سچا ہمدرد جس نے ملت کا بڑی ہمدردی سے مقابلہ کیا اپنے پر دشمن کے حملوں کو کمال جرأت سے روکتا گیا وہ موت کے ظالم ہاتھوں سے موت کی نیند سو گیا۔ اس کی کئی حسرتیں دل میں رہ گئیں۔ مرتے وقت بھی اس کے دل میں قوم کا درد تھا۔ اور وہ اپنی قوم کے لئے رو رہا تھا۔" (کتاب روحِ کوثر)

دوسرے دن ساڑھے پانچ بجے جنازہ اٹھایا گیا۔ مدرسۃ العلوم کا کل اسٹاف۔ تمام طالب علم۔ اسٹیشن کے یورپین اور ہندوستانیوں افسر اور اہلکار علیگڑھ کے رئیس اور ہر درجہ کے مسلمان اور ہندو عیسائی اس کثرت سے جنازہ کے ساتھ تھے کہ غالباً اس نوعیت کا اژدھام علیگڑھ میں پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ ۶ بجے کرکٹ فیلڈ میں نماز جنازہ ہوئی۔ گارڈ آف آنر نے پریذیڈنٹ ان آرمس کی سلامی اتاری اور اس محسن قوم کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

قوم کے سرمایۂ مجد و عار از دست رفت
بعد ازاں کا ایں گنج نادر خاکداں اند اختند
تا قیامت گوئی از تاراج ما فارغ شدند
کہ ایں مصیبت بر سر اسلامیاں اند اختند

ان کی تاریخ وفات لفظ غفران سے نکلتی ہے۔ یہ عظیم شخص جب تک زندہ رہا۔ اپنے ہاتھ پاؤں، زبان قلم، جان، مال سے اپنی قوم کی امداد کرتا رہا اور جب مر گیا تو اپنی محبت اور اپنے کام کی عظمت کا نقش لوگوں کے دلوں میں یادگار چھوڑ گیا۔

سر سید احمد خاں کی ایک بڑی مذہبی اور قومی خدمت رسالہ تہذیب الاخلاق کا جاری کرنا ہے۔ جو مسلمانوں کے لئے آب حیات ثابت ہوا۔ مسلمانوں نے جب دیکھا کہ ایک ناصح شفیق کمال دلسوزی سے ان کو نیند سے جگاتا ہے۔ ان کی غفلت پر ملامت کرتا ہے۔ ان کے اسلاف کے کارنامے سنا کر ان کو غیرت دلاتا ہے، ان کو ترقی کرنے کا گُر بتاتا ہے۔ اور وہ سب اُن کے پاس آ کر جمع ہو گئے۔ ہندوستان میں مسلمان چاروں طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے تھے۔ عیسائی مشنریاں ان کو اپنی طرف کھینچ رہی تھیں حکومت ان سے متنفر تھی اور بہت بدظن تھی۔ انگریزی تعلیم کے نتائج بھی ان کے حق میں بُرے ثابت ہو رہے تھے۔ سر سید پہلا شخص تھا جس نے ان تمام خطرات کا بڑی پامردی سے مقابلہ کیا اور توقع سے زیادہ اس میں کامیابی حاصل کی۔ اُس نے ان تمام اعتراضات جن کے ذریعہ سے عیسائی مسلمانوں کو دام میں لاتے تھے کے منہ توڑ جواب لکھ کر عیسائی مشنریوں کی تبلیغات کو ناکام بنا دیا۔ اُس نے ان تمام غلط فہمیوں کو دفع کیا جو اسلام کے متعلق عیسائیوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے بدلائل ثابت کر دیا کہ دنیا میں کوئی مذہب بھی اسلام سے زیادہ عیسائیوں کا دوست نہیں ہے۔ انگریزی تعلیم کے مضر اثرات سے مسلمانوں کو بچانے کے لئے ساری عمر کوشش کرتا رہا۔ اور اس کے تمام برے پہلوؤں کو ختم کر کے مسلمانوں میں اس کو رائج کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ سر سید نے خطبات احمدیہ کے نام سے ایک کتاب لکھ کر انگریزوں کی مسلمانوں سے بدظنی کو دور کیا۔ انہوں نے مزہ وہ کی ایک تفسیر لکھی جو وقتی لحاظ سے بہت کارآمد ثابت ہوئی۔ "ابطال غلامی" کتاب لکھ کر عیسائیوں

کے کئی اعتراضات کا جواب دیا۔

سر سید کی کوشش سے جو نمایاں انقلاب مسلمانوں کی سوشل حالت میں ہوا وہ اس مغائرت اور نفرت کا دور ہونا تھا جو انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان قبل سمندر کے حائل ہو رہی تھی۔

غرضیکہ اس عظیم ہستی نے ہندوستان اور ہندوستانیوں اور خاص کر مسلمانوں کے لئے وہ وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جن کی وجہ سے رہتی دنیا تک ان کا نام ادب اور تعظیم سے لیا جاتا رہے گا۔

اسلامی ہندوستان کے اہم ترین تاریخی کتب کی اشاعت اور بادشاہان دہلی کے آثار باقیہ کی یادداشت اور بقا کے لئے جو کوششیں انہوں نے کیں۔ شاید ہی کسی اور فرد واحد سے بن آئی ہوں بلکہ شاید کسی اور کو اس کی ضرورت کا پورا احساس ہوا ہو۔ اُن کی اہم ترین کتاب آثار الصنادید ہے۔ جس میں دہلی اور نواح دہلی کی عبادات کی تاریخ بڑی محنت اور عرق ریزی سے لکھی گئی ہے۔ اور جس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں گلدسن وتاسی نے کیا اس ترجمہ کو دیکھ کر رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن نے ۱۸۶۴ء میں ان کو آنریری سیکرٹری مقرر کیا۔ اس کے علاوہ سر سید نے آئین اکبری اور تاریخ فیروز شاہی کے صحیح نسخے تیار کئے۔ تزک جہانگیری کو شائع کیا۔ اور تاریخ سرکشی بجنور مرتب کی۔ سر سید کی مذہبی تصانیف بہت زیادہ ہیں۔ بقول مولانا حالی "مذہب کی ہی آغوش میں انہوں نے پرورش پائی تھی۔ اور مذہب کی گود میں انہوں نے ہوش سنبھالا ۱۸۳۹ء سے لے کر جب انہوں نے رسول اکرمؐ کے مختصر حالات لکھے ۱۸۳۹ء تک جب وہ

امہات المؤمنین کے متعلق ایک عیسائی مصنف کے اعتراضات کا جواب لکھتے لکھتے وفات پا گئے برابر ساٹھ سال وہ مذہبی خدمات سرانجام دیتے رہے۔

مولانا شبلی سرسید کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

وہ پرزور دست وقلم جس نے اسبابِ بغاوتِ ہند لکھا تھا۔ اور اُس وقت تک لکھا تھا جب کورٹ مارشل کے ہیبت ناک شعلے بلند تھے۔ وہ بہادر جس نے پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت میں لارڈ ڈلٹن کی تقریروں کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔ اور جو کچھ اُس نے ان تین آرٹیکلوں میں لکھا کانگرس کا لٹریچر حقوق طلبی کے متعلق اُس سے زیادہ پُرزور لٹریچر پیدا نہیں کر سکتا۔ وہ جانباز جو آگرہ کے دربار سے اس لئے برہم ہو کر چلا آیا تھا کہ دربار میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی کرسیاں برابر درجہ پر نہ تھیں۔ ۔۔۔ الخ (الہلال ۳۰ مئی ۱۹۱۳ء) مولانا ابوالکلام آزاد جو سرسید کے سخت مخالف تھے۔ ۱۱ جون ۱۹۱۳ء کے الہلال میں ان کی تعریف کرتے نظر آتے ہیں۔

ص۳ سرسید نے جس تحریک کی رہنمائی کی اس کے کئی پہلو تھے تعلیمی، مذہبی، معاشرتی سیاسی اور ادبی مولانا شبلی لکھتے ہیں۔ سرسید کے کارناموں میں ایک اہم کام اردو لٹریچر کی ترقی تھا۔ سرسید کی بدولت اردو اس قابل ہوئی کہ عشق وعاشقی کے دائرہ سے نکل کر ملکی۔ اخلاقی، سیاسی، مذہبی، تاریخی مضامین بڑی صفائی اور سادگی سے ادا کر سکتی ہے۔ اس تحریک کا اہم مقصد اعلٰے تعلیم کی اشاعت تھا۔ جو کافی حد تک پورا ہوا۔

# ذہنی مدّوجزر

راہ نوردانِ حیات ـــــ پیچیدہ راستوں میں گامزن ہونے سے گریز کرتے ہیں ۔ وہ ایسے راستوں کو پسند کرتے ہیں جہاں ان کا سفر سہولت سے انجام پذیر ہو لیکن ایسے راستوں کو تلاش کرنے والے راہی منزل کی صحیح قدر و قیمت سے ناآشنا ہوتے ہیں ۔ اور نہ ہی وہ منزل کے حقیقی سکون سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں ۔ منزل کی عظمت کا احساس انہی مسافروں کو ہوتا ہے جو سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہیں جن کی جبینیں گرد آلود ہوتی ہیں اور جن کے پاؤں آبلہ زدہ ہوتے ہیں ـــ زندگی کے راستے اگر سہولت ...... سے کٹ جائیں تو راہگیروں کو سوزِ سفر کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا ۔ مسافت کا مزہ ہی اس تلخ حقیقت میں ہے ۔ کہ راہ نوردوں کے قدم راہوں کے نشیب و فراز سے کھیلتے رہیں ۔

آزادی کی منزل تک ہم جن راستوں سے گزر کر پہنچے ہیں، ان راستوں

کے ہر مرحلہ میں آگ اور خون کے طوفان تھے - بربریت و درندگی کے سیلاب تھے اور جبر و قہر، ظلم و استبداد کی آندھیاں قیامت برپا کر رہی تھیں - ہم نے ان جان لیوا راہوں میں آزادی کی منزل تک پہنچنے کا سفر شروع کیا تھا - اور یہ راہیں کس قدر ہلاکت آفریں ثابت ہوئیں - ان گنت شہیدانِ آزادی کی یادیں اس کا احساس دلاتی ہے - ہم نے دشوار ترین اور ناممکن السفر راستوں کو اختیار کیا - آزادی کی منزل تک پہنچنے، اور اس منزل کی قدر و قیمت اور عظمت کا احساس ہوا -

حصول آزادی کے بعد - اب ہمارے سامنے آزادی کی عظمت، وقار، حفاظت استحکام اور بقا کا سوال درپیش ہے - یہ بھی ہماری ایک نئی منزل ہے - اور اس منزل تک پہنچنے کے بھی بے شمار راستے ہیں - ان راستوں میں اگرچہ آگ اور خون کے سیلاب نہیں ہیں، لیکن ایسی آندھیاں اور طوفان ضرور ہیں جو ہمارے جذبہ ہمت سے نبرد آزما ہو سکتے ہیں - مصائب و مشکلات کے ان ہنگاموں کو دیکھ کر جی ہارنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ذہن میں یہ تصور بٹھانے کی ضرورت ہے - کہ ان سنگین مرحلوں سے گذر کر ہی ہمیں نئی منزل کی بساط پر سکون و اطمینان کی دولت نصیب ہو سکتی ہے - ان سے نبرد آزمائی کے بعد ہی ہمیں منزل نو سے لطف اندوز ہونے کا موقع مل سکتا ہے -

ہم جب اپنے وطن کے مختلف گوشوں پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے - جیسے زندگی ایک مسلسل تحریک کا روپ دھار گئی ہے - اس تحریک کا منظر یقیناً بڑا خوشگوار ہے - لیکن اس تحریک سے جو تاثرات پیدا ہوتے ہیں - وہ نہ تو خوشگوار ہیں نہ حوصلہ افزا - صنعت و حرفت کے شعبہ کو دیکھیں تو وہاں دن رات کام ہو رہا ہے - ہر سال کروڑوں گز کپڑا تیار ہوتا ہے - لیکن جب ہم

ملک کے عوام کو مناسب لباس سے محروم دیکھتے ہیں تو ایک بار عقل یقیناً چکر کھا کر رہ جاتی ہے۔ ان کارخانوں اور ملوں میں کارکردگی کا معیار تو بڑا خوشگوار ہے۔ لیکن تاثرات اور نتائج جو عوامی سطح پر ہمیں عملی صورت میں دکھائی دیتے ہیں وہ بڑے مایوس کن ہیں۔ ایک عام آدمی کو یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ اس کے پاس گرمی اور سردی کے لئے مناسب و معقول لباس نہیں ہے اور اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی کتنی تلخ ہے کہ بعض ایسے انسان بھی ہیں جن کے سامنے کپڑوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ اور انہیں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کونسے لباس کو زیب تن کیا جائے۔

ایک آدمی کو لباس میسر نہیں ہے اور دوسرے کے پاس لباس کے انبار ہیں۔ یہ دونوں پہلو افسوسناک بھی ہیں اور مایوس کن بھی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی ذمہ داری کس پر عائد کی جائے۔ تو کسی ایک فرد کو ذمہ دار ٹھہرانے کی بجائے یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ قومی ذہن قومی شعور کے حقیقی تصورات سے خالی ہے۔۔۔

شعبہ زراعت بھی ترقی پذیر ہے۔ زرعی اصلاحات کو نئی حکومت کا ایک معجزہ خیال کیا جاتا ہے۔ پیداوار کو بڑھانے کے لئے مختلف ادارے قائم کئے جا چکے ہیں۔ زمینوں کو سیراب کیا جا رہا ہے۔ سائنسی آلات استعمال میں لائے جا رہے ہیں۔ بیمار زمین کو قابلِ کاشت بنایا جا رہا ہے۔ غیر ملکی ماہرین سے امداد و تعاون حاصل کیا گیا ہے۔ باہر سے غلہ بھی منگوایا جاتا ہے۔ لیکن ان تمام مساعی کے باوجود۔ ایک عام آدمی کے دل سے پوچھئے۔ جب وہ گندم خریدتا ہے تو یوں محسوس کرتا ہے۔ جیسے وہ ایک ایک دانہ گندم کے لئے بطور قیمت اپنے لہو کی ایک ایک بوند ادا کر رہا ہے۔ کس قیامت کی یہ الجھن

ہے۔ جسے ذہن حل نہیں کر سکتا۔

غلہ کی پیداوار میں اضافہ ہو رہا ہے اور ادھر گندم کی قیمت میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ جانے یہ کیسا معما ہے اور اسے کیونکر حل کیا جا سکتا ہے۔ مہنگائی نے عوام کی قوتِ خرید کو جس بری طرح متاثر کیا ہے۔ اس کا تصور ذہنی موت کی ایک علامت ہے۔۔۔

زمین بھی وہی ہے اور اس کی خاصیت بھی وہی۔ انسان بھی وہی ہے بلکہ اس کی ہمت اور تگ و دو تو پہلے سے زیادہ ہے لیکن اس کے باوجود اجناس خوردنی عوام کی دسترس سے باہر ہیں۔ ایک بڑی عجیب بات یہ ہے کہ اشیائے خوردنی کی پیداوار میں اضافہ اور اس اضافہ میں مزید ملاوٹ اور آمیزش کا اضافہ اور پھر اتنے سارے اضافوں کے باوجود ہر چیز کے بھاؤ آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ ملاوٹ اور آمیزش کا "کاروبار" جو کچھ بھی ہے اس کا ذکر نہ کیجیے، لیکن اس حقیقت کو سامنے رکھیے کہ دس من گھی کو چربی اور دوسری چیزوں کے "اضافہ" سے کم از کم پندرہ من تو ضرور بنا لیا جاتا ہے۔ گویا ایک جنس کی حقیقی تعداد میں یہ "فنی اضافہ" کچھ نہ کچھ اس جنس کو بڑھا ہی دیتا ہے۔ اس کے باوجود یہ مسئلہ سمجھ میں نہیں آتا کہ پیداوار میں قدرتی اور مصنوعی اضافہ کے باوجود مہنگائی کا طلسم کیوں نہیں ٹوٹتا۔۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟

ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری تاجرانہ ذہنیت پر عائد ہوتی ہے۔ منافع خوری کے رجحان نے تاجروں کو اس حد تک اندھا کر دیا ہے کہ وہ مختلف حیلوں بہانوں سے عوام کے روزمرہ استعمال کی اشیاء کو مہنگا بیچنے سے نہیں ڈرتے۔۔ نہ انہیں خدا کا خوف ہے اور نہ حکومت اور اس کے قانون کی پرواہ۔۔ یہ طبقہ غریبوں کا لہو چوستا ہے۔۔ اور ہر

سال ایک دو منزلہ کوٹھی تعمیر کراتا ہے۔

جس قوم کے تاجر اس ذہنیت کے مالک ہوں بھلا اس قوم کی مشکلات کے خاتمہ کا کیا امکان رہ جاتا ہے۔ یہ لوگ مصیبتوں کا خاتمہ کرنے کی بجائے ان میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس پست اور خطرناک ذہنیت نے عوام کی حالت کو اس حد تک خراب کر رکھا ہے کہ فلاح کی کوئی صورت۔ کوئی تدبیر اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔

بجا کہ۔ ملک کے طول و عرض میں غلہ کی پیداوار روبہ ترقی ہے۔ زمین کو قابل کاشت بنایا گیا ہے۔ آب پاشی کے لئے بارش، دریا، نہریں اور ندی نالوں کے پانی کے علاوہ ٹیوب ویل لگائے گئے ہیں۔ کسان پورے خلوص سے محنت کر رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود خوراک کی قلت محسوس ہو رہی ہے۔ اجناس خوردنی مہنگے بھاؤ بک رہی ہیں۔ گندم کی مہنگائی کا ایک جواز یہ پیش کیا جاتا ہے کہ گندم کی قیمت فروخت کو اگر کم دیا گیا تو کسان طبقہ کاشتکاری میں دلچسپی لینا کم کر دے گا۔ گویا گندم کے نرخوں کو دانستہ اونچا رکھا جاتا ہے کہ کسان لوگ کھیتی باڑی کے فن کو خیرباد نہ کہہ دیں۔ چلو یہ منطق درست ہی سہی لیکن شہری لوگوں کی قوت خرید کو بھی تو نگاہ میں رکھنے کی ضرورت ہے۔

- کسان کی زرعی دلچسپی اور شہری عوام کی قوت خرید کے درمیان کوئی معقول تناسب ہونا چاہیئے۔
- گندم کے نرخ اتنے اونچے بھی نہیں ہونے چاہیئں کہ شہری لوگ زندگی ہی سے بیزار ہو جائیں۔
- دونوں طرف اپنی اپنی دلچسپی کو بحال رکھنے کی ضرورت ہے۔
- اقتصادیات کی رو سے بھی یہ تقسیم غلط ہے۔

کسان ہو یا شہری انسان - دونوں ہی ایک ملک کے رہنے والے ہیں۔ حکومت کو دونوں کے مفادات کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے - اس قسم کی بے قاعدگیوں نے زرعی اصلاحات جیسے قابلِ فخر معجزہ کو بھی بے اثر کر رکھا ہے۔

اصلاحات کا مقصد پوری قوم کا مفاد ہے - اصلاحات کا یہ مقصد کبھی نہیں ہوتا کہ قوم کا ایک طبقہ تو گھر میں دودھ کی نہریں بہالے اور دوسرا طبقہ پانی کی بوند کو ترسے۔

ہماری زندگی محض ایک پروپیگنڈہ بن کر رہ گئی ہے - اس پروپیگنڈہ نے زندگی کو اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے - ہم دلفریب اعلانات سنتے رہتے ہیں۔ خوبصورت آوازیں ہماری سماعت سے ٹکراتی رہتی ہیں لیکن ہماری کوئی نہیں سنتا - عوام کی چیخوں اور فریادوں پر کوئی کان نہیں دھرتا - یہ گرانگوشی کبھی ملک کی تعمیر اور قوم کی فلاح و بہبود کی آئینہ دار نہیں ہو سکتی - عوام کو ایسی زندگی کی ضرورت ہے جس کے دامن پر ٹھوس سہولتیں موجود ہوں - نعرہ بازی نہ ہو۔

نعرہ بازی تو محض غلط جذبات کی پیداوار ہوتی ہے - اور ظاہر ہے کہ غلط جذبات کا استعمال کبھی کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا۔

بلاشبہ آزادی ایک نعمت ہے اور ہم خوش قسمت ہیں کہ یہ نعمت ہمیں میسّر آئی ہے - لیکن ذرا اس نعمت کا تجزیہ تو کیجیے - اور انصاف سے کہیے کہ ہماری زندگی کہاں تک پر سکون ہے - آزادی کو بڑے فخر کے ساتھ زندگی کے چمنستان کا ایک سدا بہار پھول کہا جاتا ہے - اور جب یہ پھول دلوں میں اتر کر ایک کانٹا بن جائے تو بتایئے کون اس پھول سے پھر رغبت رکھے گا۔

آزادی واقعی آسمان حیات کا ایک آفتاب ہے —— اور اگر یہ آفتاب زندگی کے اندھیروں کا خاتمہ نہ کرے تو کیا اسے آفتاب کہنا درست ہے ۔—— اس سوال کا جواب مثبت نہیں منفی پہلو رکھتا ہے ۔ یہ بیداری نہیں بلکہ ایک شدید قسم کی غنودگی ہے جو ذہن، فکر، احساس، جذبہ اور تصوّر پر ایک عرصہ سے محیط ہے اور کوئی بھی وقت کے اس افسوں کو شکست دینے کی سعی نہیں کرتا۔

جب ہم اس حقیقت کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ عوام زندگی کی سہولتوں سے محروم ہیں —— انہیں پیٹ بھر روٹی میسر نہیں ہوتی ۔ محنت و مشقت کے باوجود انہیں کبھی کبھی بھوکا سونا پڑتا ہے —— انہیں تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا نہیں ملتا —— وہ سردی کے موسم میں ٹھٹھر کر مرتے ہیں ۔ اور گرمی کے موسم میں جھلستے رہتے ہیں ۔ ان کے پاس رہنے کے لئے کوئی معقول جگہ نہیں ہے ۔ ان کے بچے تعلیم سے محروم ہیں ۔ اور کوئی صاحب دل اس طرف متوجہ نہیں ہوتا——

بیمار ہو جائیں تو دوائیں میسر نہیں ہو سکتیں مر جائیں تو کفن کا سوال پیدا ہوتا ہے ۔ غرضیکہ عوام جس قدر مصیبتوں میں گرفتار ہیں ان کا تصور تو ممکن ہے ۔ لیکن صحیح اندازہ لگانا قطعی ناممکن ہے ——!

فکرِ صیاد، غمِ دام و قفس خوفِ خزاں
ہو بلا ایک تو سر سے اسے ٹالے بلبل

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ نئی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں ۔ لیکن یہ تسلیم کرنے سے معذور ہیں ۔ کہ ان تبدیلیوں نے زندگی پر کوئی اثر ڈالا ہو ۔ ان تبدیلیوں سے کبھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا ۔ فائدہ اسی صورت میں

ممکن ہے کہ ہم اپنے ذہنوں کو بدل دیں۔ اپنے اندازِ فکر میں تبدیلی پیدا کریں۔ اور یہ سوچیں کہ اب ہم ایک آزاد وطن کے شہری بھی ہیں اور رکھوالے بھی۔ ہم نے اپنے وطن کی حفاظت کرنا ہے ۔۔ اور اسے تعمیر و ترقی کی انتہائی بلندیوں تک لے جانا ہے۔ اس لئے ہمیں اپنے آپ کو بدل دینے کی ضرورت ہے۔ جب تک ہمارے خیالات تغیر پذیر نہیں ہوتے، ملک میں پیدا ہونے والی تبدیلیاں غیر موثر رہیں گی۔ اور تعمیر و ترقی کا غوغا سن کر ہم محفوظ ہونے کی بجائے پریشان ہو جائیں گے۔ کیونکہ اس کے نتائج کسی صورت میں بھی حوصلہ افزا نہیں ہوں گے۔

موجودہ دور میں عوام کی درماندگی و واماندگی نے اسے پس ماندگی کے مغاک میں اتار چھوڑا ہے۔ وہ لوگ جو عوامی سطح سے بلند ہیں وہ جب اظہارِ خیال کرتے ہیں تو عوام ہی کو اس زبوں حالی کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک عوام جاہل ہیں۔ کم شعور ہیں، بد اخلاق ہیں، انہیں آزادی کی عظمت کا احساس نہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ وطن کی محبت کس بلا کا نام ہے۔ وہ قومی اخوت کے مفہوم کو نہیں سمجھ سکتے۔ وہ خود غرض ہیں خود پرست ہیں ۔۔۔ یہ تمام اعتراضات ایک لمحہ کے لئے فرض کر لیجئے۔ کہ درست ہیں لیکن یہ بتائیے کہ "اونچے خیالات" کے یہ نشتر عوام کے زخم ہائے محرومی کا علاج ہیں؟۔۔۔ کیا عوام جب اپنے بارے میں اس قسم کے اعتراضات سنتے ہیں تو ان کے دل میں قوم کے لئے محبت پیدا ہوتی ہے یا نفرت؟۔۔۔ ہمارے خیال میں تو اس قسم کی باتیں اچھے نتائج پیش نہیں کرتیں۔ تنقید کرنا ایک مفید بات ہے۔ لیکن وہ افراد جو تنقید کا صحیح مذاق و شعور ہی نہیں رکھتے ۔۔ ان کی تنقید اصلاحِ عوام کا موجب کبھی نہیں بن سکتی ۔۔ ایسی تنقید سے بات بنتی نہیں بگڑتی ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ عوام کو کام کرنے کا شعور بھی سکھایا جائے اور موقع بھی دیا جائے۔ ان کے لئے ایک ایسی فضا پیدا کی جائے جہاں وہ کام کر سکیں۔ جہاں وہ ملکی اور قومی فلاح و بہبود کے بارے میں سوچ سکیں عمل کر سکیں۔ ایک طرف تو ہم ان کے بال و پر نوچ ڈالیں اور دوسری طرف ہم یہ فرمائش کریں کہ وہ بلند فضاؤں میں اڑ کر دکھائیں، کیا یہ ممکن ہے؟ —— اس وقت عوامی زندگی، ایک ایسے راستہ میں پا شکستہ ہو کر رہ گئی ہے۔ جہاں بڑے بڑے خوفناک قسم کے مدّ جذر دکھائی دیتے ہیں۔ ہمیں ایک نئی منزل تک پہنچنا ہے۔ اس مدّ جذر کا مقابلہ کرنے کے لئے عوام میں ہمت اور قوت کی ضرورت ہے۔ اگر عوام کو یہ دولت میسر آ جائے تو نئی منزل روشنیوں کے پھولوں سے منور بھی ہو سکتی ہے اور مہک بھی سکتی ہے ؀

# حقیقت کی تلاش

اللہ تعالےٰ نے انسان کی تخلیق کے وقت اس کی فطرت میں ایک جذبہ رکھا۔ جس کی وجہ سے اس کی بقا ہے۔ اگر یہ جذبہ اس کے اندر نہ ہوتا تو یقیناً آج کل جو کائنات کا حسن ہمیں نظر آرہا ہے نہ ہوتا یہی جذبہ انسان کو حیوان سے ممیز کرتا ہے۔ یہی جذبہ اس کے اندر قوت ارادی، جستجو اور تمام کائنات سے افضلیت جیسی صفات پیدا کرتا ہے اور بقائے نسل کا سبب ہے اور اصل میں انسانیت کی معراج بھی یہی ہے۔ کیونکہ انسان اس کائنات میں اپنے آپ کو گھرا ہوا پاتا ہے۔ یہ وسیع و عریض کرۂ ارض جو انسان کا مسکن ہے۔ بذات خود نظام کائنات کا حقیر سا جزو ہے، اور بالکل آفتاب کو بھی یہی حیثیت حاصل ہے۔ اس اعتبار سے انسان اس دنیا کی ایک حقیر سی چیز ہے جو بظاہر تمام کائنات میں کمزور و نحیف ہے۔ لیکن اللہ تعالےٰ نے اس کے اندر ایک چنگاری پنہاں رکھی ہے جس کی طرف قبل ازیں اشارہ کیا گیا ہے اور یہی اسے آفاقی وسعتوں سے بھی آگے لے

جانا چاہتی ہے۔

انسان کے اندر تلاش و جستجو کے ان تھک جذبہ کی تخلیق کسی اتفاقی حادثہ کا سبب نہیں بلکہ یہ عین منشائے الٰہی ہے۔ کیونکہ تلاش حقیقت ہی دراصل وہ سیماب صفت جذبہ ہے جو انسانیت کو لازوال حسن بخشتا ہے۔ اور یہی صفت سر انسانی معراج کا حقیقی راز ہے۔

انسان کی اسی صفت نے اس کو اول سے آخر تک دو قسم کے سوالات سے دوچار کر رکھا ہے۔

پہلا سوال جو اس کے ذہن میں ابھرتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسان کی تخلیق اس کائنات میں کیوں کی گئی۔ اور عالم وجود میں آنے کے بعد اسے کیا مقام دیا گیا؟ اور اس مقام میں اسے کون کون سے آداب سے بہرہ ور ہونا چاہئیے۔

دوسرا سوال اس کے مادی نظریہ کی غمازی کرتا ہے۔ کہ انسان کس طرح اس کائنات پر قابو پاکر زندگی کو پُر کیف اور پُرسرور کر سکتا ہے۔

یہی دو سوال انسان کی زندگی کی راہوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ کسی ایک نظریہ سے وابستگی انسان کے فعل کو متاثر کرتی ہے۔ موجودہ ماحول میں نوعِ بشر کا رجحان پہلے نظریہ سے وابستہ ہے وہ دوسرے نظریہ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے بلکہ اسے فرسودہ خیالات کا نام دے کر اتمام حجت کر دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی کو صرف ایک سوال سے سروکار رکھنا چاہئیے، یعنی مادی فراوانی۔۔۔

یہ نظریہ انسان کی نظر و عقل کا سراب ہے۔ مادی دنیا کی انتہا کو پہنچنے کے بعد بھی انسان کے بنیادی مسائل حل نہیں ہوتے۔ کیونکہ انسان کی بقار اور تخلیق

کا مقصد دولت نہیں تھا۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ انسان کی زندگی میں جب بھی مشکل و آزمائش کا دور آتا ہے۔ تو اس کا حل مادی دولت کی فراوانی نہیں، بلکہ ایمان و یقین کی غیر متزلزل قوت ہوتی ہے۔

زمانہ ابتدا سے ہی انسان کو اس حقیقت کا پتہ تھا۔ چنانچہ اس نے پیٹ کی آگ کو بجھانے کے علاوہ قدرت کے اس نظام کے لئے بھی اپنی قوتیں صرف کیں اور کچھ بُرے بھلے اعتقادات سے وابستہ رہا جو اس وقت اس کی ناقص عقل سمجھ سکی یعنی اس نے انسانی فطرت کے ان دو بنیادی نظریات کے ساتھ ہم آہنگی اختیار کرنے کے لئے مادی وسائل کے ساتھ اپنی روح کی بالیدگی کے لئے بھی اثاثہ جمع کیا اور بعدۂ اس کے اسی اثاثہ نے آجکل کے مختلف علوم کو جنم دیا ہے۔ جو علوم انسانوں کو مادی آسائش سے ہمکنار کرتے ہیں ان کو سائنس کا نام دیا گیا ہے، اور اسے مختلف شکلوں میں ہمارے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ اور انسان کی ذہنی اور روحانی قوتوں کو مسرت و انبساط فلسفہ اور مذہب قرار پایا۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ان علوم میں سے کون ہماری ضروریات کو کما حقہٗ پورا کرتا ہے اور اس کا دائرہ عمل کیا ہے۔ اور راکِ حقیقت کی یہ راہیں مختلف زاویہ ہائے نگاہ رکھتی ہیں۔

دنیا کی تاریخ پر نگاہ ڈالنے سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ نوعِ بشر ازل سے ہی اس بات کی متلاشی ہے۔ اور قدرت کا یہ مضمر راز معلوم کرنے کے لئے تڑپتی رہی ہے کہ یہ کائنات کیا ہے اس کی تخلیق کا اصل مقصد کیا تھا۔ اس کائنات کی ابتداء و انتہا کی کونسی حدود ہیں اور اس کا انجام کیا ہے؟

ان سوالات کے جواب کے حصول کی خاطر انسان نے اپنی تمام توانائیاں صرف کیں، اور اپنے ذہنی قوا کو اس ریاضت میں مصروف رکھا۔

حقیقت کا ادراک حاصل کرنے کے لئے انسان کے پاس صرف ایک گوہر نایاب تھا جو اس کے نحیف و نزار جسم، کائنات میں اس کی کم ہمتی اور بے وقعتی کے باوجود بھی اسے تمام حیوانات پر فوقیت عطا کرتا ہے۔ گو کائنات میں کئی حیوانات کے مختلف حواس انسان کے حواس سے زیادہ طاقت رکھتے تھے۔ لیکن انسان کے اس گوہر نے اسے وہ طلسماتی قوت بخشی تھی جس کی وجہ سے اس نے نتائج اور حقائق کو یکجا کر کے واقعات کی بنا رکھی اور حالات کا دھارا موڑ دیا یہ طلسماتی نایاب گوہر انسان کی عقل تھی۔ دراصل عقل ہی انسان کو فہم و تفہیم کی قوت سے سرفراز کرتی ہے اور حیوانی سطح سے بلند کرتی ہے۔

حواس اور عقل کی راہنمائی میں انسان نے جن طریقوں کو کام میں لاکر قدرت کے رازوں کو آشکارا کیا اسے سائنس کا نام دیا گیا۔۔ سائنس کے علوم کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا اور قدرتی و معاشرتی علوم کے ناموں سے انہیں نوازا گیا۔ ان علوم کی مدد سے انسان نے تحقیقات کیں۔ نتائج اکٹھے کئے اور نتائج برآمد کرنے کے بعد بھی اس کی نگاہ کی رسائی صرف اس حد تک پہنچ سکی کہ اس کے بعد کچھ ہے جو ابھی تک تشنۂ کام ہے۔ کام جاری ہے اور اب بھی سائنسدان دن رات تجربہ گاہوں میں تجربات و مشاہدات کی دنیا میں کھوئے ہوئے ہیں۔ اور وہ بجلی کی سی تیز رفتاری سے ارتقاء کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔ لیکن ساری کوششوں کے باوجود سائنسدانوں کو یقین ہے کہ وہ غالباً نظام کائنات کی حقیقی تہوں کو نہیں پہنچ سکیں گے۔ سائنس کی ماہیت معلوم کرنے سے ہم اس علم کے متعلق یہ نظریہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ،

"سائنس صرف عالم اسباب کا احاطہ کرنے کی مجاز ہے اس کی دنیا صرف مشاہدات و تجربات تک محدود ہے۔ یہ علم صرف اشیاء کے درست یا غلط کا ہی محاسبہ کر سکتا ہے۔ اسے مابعد الطبیعاتی مسائل سے بحث نہیں۔ اس کی تجربہ گاہیں آخرت کی زندگی، جنت، دوزخ اور یوم الحساب جیسے مسائل سے خالی ہیں۔ کیونکہ ان مقامات پر انسان کی عقل اور علوم مشاہدہ کی قوت سے کام نہیں لے سکتے"!!

مگر حقیقت کا ادراک حاصل کرنے کے لئے انسان کے پاس ایک اور ذریعہ بھی ہے اور انسان نے اس میدان میں بھی کافی زور مارا ہے۔ یہ علم فلسفہ ہے جس کی حدود صرف عقلی استدلال تک محدود ہیں۔ یعنی انسان بعض مسلمہ اصولوں اور ناقابلِ انکار حقائق سے شروع کرکے خالی عقلی استدلال پر ایک جامع نقشہ تیار کرتا ہے۔ اس لائحہ عمل میں اسے حقائق و شواہد سے کوئی سروکار نہیں، بلکہ اس کی اساس صرف استدلال و نظریات پر ہوتی ہے۔ جہاں سائنس تجربوں اور مشاہدوں کے اندر اپنے علم کو مقید کر دیتی ہے۔ وہاں فلسفہ ان حدود کو پھلانگ جاتا ہے۔

لیکن یہ راہ نہایت ہی پُر خطر اور بھیانک ہے اور اس کے نتائج تباہی کا موجب بن جاتے ہیں۔ عقلی استدلال کی رہنمائی صرف عالم اسباب تک منفعت بخش ہو سکتی ہے۔ لیکن اس سے آگے اس کی راہنمائی سے متضاد قسم کے نظریات جنم لے سکتے ہیں۔ مثلاً ایک فلسفہ دان یہ ثابت بھی کر سکتا ہے کہ اس کائنات کا خالق کوئی نہیں اور یہ بھی قرینِ قیاس ہے کہ دوسرا ثابت کرے کہ اس کا خالق خدا ہے۔ آج کل ہمارے معاشرے میں ہر دو قسم کے نظریات چل رہے ہیں۔ ہمارے سامنے ہیگل کا نظریہ جدلیات اور کارل مارکس کا نظریہ موجود

ہے۔ دونوں کے نظریات میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔جیسا کہ کارل مارکس نے نظریہ جدلیات کی توجیہہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہیگل نے جس نظریہ کو سَر کے بل کھڑا کر دیا تھا میں نے اسے سیدھا کھڑا کر دیا ہے ۔

فلسفہ کا چونکہ سارا دار و مدار عقلی استدلال پر ہے، اور انسانی عقل عالم اسباب سے آگے مسائل حل کرنے میں ناچار ہے ۔ اس لئے ہمیں اس پر کامل اعتماد اور بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے ۔

اب دو راہوں کے علاوہ ایک اور راہ ہے، جسے انسان کی عقل متعین نہیں کرتی بلکہ وہ ذات جو اس کائنات کی خالق تھی اسی نے ہی یہ راہ معین کی کیونکہ خالق حقیقی کو اپنی مخلوق کے عقل و علم کا اندازہ تھا ۔ اس لئے خود ہی اس عقدہ کا احسن حل انسان کے سامنے پیش کیا ۔ اس راہ کا نام مذہب ہے ۔

اس راہ کی شرح چونکہ خود ذاتِ بابرکات نے پیش کی ۔ اور اس راہ کی اصل انسانی دماغ سے بالا ہے ۔ اس میں انسانی تجربات و مشاہدات کا دخل نہیں بلکہ اللہ تعالےٰ یہ حقیقت اپنے بندوں پر خود واضح کر دیتا ہے اور اس کا طریق خود اسی ذات نے وحی منتخب کیا ۔ لیکن یہ عنایاتِ کرم عام کے لئے نہیں بلکہ خواص کے لئے ہوتی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ خود انتخاب فرماتا ہے اور ان برگزیدہ بندوں پر اپنی کیفیت ظاہر کرتا ہے ۔ یہ فوق العادت انسان خدا کے انبیاء کہلاتے ہیں اور یہ نہ صرف خود خدائے ذوالجلال کے حسن کا نظارہ جی بھر کر کرتے ہیں، بلکہ ہر پیاسے کی روح کو اس شیریں شربت سے مسرت اور تازگی بخشتے ہیں ۔ اور اس حسن لازوال کی تمام رعنائیاں مخلوق کے خاکوں میں بھرتے ہیں ۔ اور عام انسان اسی چشمہ سے سیراب ہوتے ہیں ۔

دنیا میں مختلف مذاہب پیدا ہوئے لیکن ان سب کا نظریہ صرف اسی

ذات کے بتائے ہوئے راہ کی نشاندہی کرتا ہے۔ تمام مذاہب نے نیکی اور خدمتِ خلق کو بنیاد قرار دیا اور اس کی تبلیغ میں جانیں تک کھو دیں اور انسان کو بلند و افتخار کرنے کے لئے اس کے دل و دماغ میں اس بات کو داخل کر دیا کہ سوائے اللہ کی ذات کے کسی سے خوف و ڈر مت کھاؤ اور یہی انسانیت کی معراج اللہ کے حضور میں مقرر ہوئی۔

---

# سائنس کے مہلک تجربات

سائنس اس وقت ہماری زندگی کا ایک اہم ترین حصہ بن چکی ہے۔ اب تو زندگی کے معمولات میں سائنس کا عمل دخل بڑھتا جا رہا ہے۔ میلوں کے فاصلے گزوں میں سمٹ گئے ہیں۔ اور وقت کی وسعت کو اس قدر بڑھا دیا گیا ہے کہ جو کام ایک دن میں ہو سکتا تھا وہ ایک لمحہ میں انجام پذیر ہو جاتا ہے۔ گویا سائنس نے سب سے بڑا کرشمہ یہ دکھایا ہے۔ کہ وقت اور فاصلہ کو ایک نیا مفہوم دے دیا ہے۔ ایک آدمی لندن میں ٹیلی ویژن پر تقریر کرتا ہے۔ اور ہم اسے اپنے گھر میں ٹیلی ویژن پر اپنے روبرو دیکھتے اور سنتے ہیں۔ یعنی ہزاروں میل کی دوری نے قربت کا مفہوم اختیار کر لیا ہے۔

روز بروز سائنس کا پھیلاؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ صرف آسمان کی وسعتیں ہی اس کی دسترس میں نہیں ہیں بلکہ زمین کو بھی اس نے اپنے احاطہ میں لے رکھا ہے۔ زراعت کا بیشتر سلسلہ سائنسی آلات کا مرہون منت ہے۔ ایٹمی توانائی کے ذریعہ

زمین کو ایک خاص قوت پہنچائی جاتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ اچھی اور زیادہ فصل کی پیداوار کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ہمارے دیہات میں بیشتر مقامات پر سائنسی آلات سے کام لیا جا رہا ہے۔ اور فصل کی حالت کو بہتر بنانے کی ایک کامیاب کوشش کی جا رہی ہے۔

اس زرعی ترقی کو دیکھ کر ہم اگر یہ کہدیں کہ سائنس، انسان کی دوست بھی ہے اور محسن بھی -- تو یہ کچھ غلط بات نہیں۔ سائنس نے بین الاقوامی زندگی کو ایک ایسے رشتہ سے باندھ دیا ہے کہ ہم لاکھوں میل کے فاصلے پر ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں تک سن سکتے ہیں۔ گویا کل انسان ایک برادری کی صورت میں ڈھل گئے ہیں۔ سائنس نے اپنی قوت سے ایسا اتحاد پیدا کر دیا ہے کہ عالمی زندگی کے افکار و خیالات ایک دوسرے کے سامنے ستاروں کی طرح روشن ہیں۔

انسان اور زمین پر سائنس کے ان تمام احسانات کا اعتراف کرتے ہوئے جب ہم اس کی بے بہا قوتوں کی خطرناکی کا تصور کرتے ہیں تو ہمارا دل خوف سے کانپ جاتا ہے۔ یہ تو سائنسدانوں کے ذہن کی بات ہے کہ وہ سائنس کی ایٹمی قوتوں کو کس انداز میں استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اسے دنیا کی امن اور سلامتی کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں یا دنیا کو قیامت آفریں ہلاکتوں کی نذر کرنا چاہتے ہیں۔

جہاں تک حقائق کا تعلق ہے دونوں باتیں ممکن ہیں اور دنیا دونوں باتوں کے نمونے دیکھ چکی ہے۔ ایٹمی قوتوں نے انسان کے لئے زمین سے زیادہ خوراک پیدا کی اور انہی قوتوں نے ہیروشیما اور ناگاساکی میں لاکھوں آدمیوں کو موت کے تابوت پر رکھ کر زمین تلے اتار دیا۔ سائنس کی ایٹمی قوت اس لحاظ سے انسان کی بہترین دوست بھی ہے اور بدترین دشمن بھی۔

سلسلہ میں روس نے ایک ایسا ایٹمی تجربہ کیا تھا جس کی وجہ سے فضا بہت

حد تک مسموم ہو کر رہ گئی تھی ۔ تابکاری شعاعیں دُور دُور تک پھیل گئی تھیں جس سے انسانی زندگی اور صحت کو کئی خطرات لاحق ہو گئے تھے۔ اس تجربہ کے خلاف دنیا کے مختلف ممالک نے احتجاج بھی کیا اور واضح الفاظ میں اس درندگی کی مذمت بھی کی ۔ ایک طرف تو تخفیف اسلحہ کے لئے مساعی جاری ہیں اور دوسری جانب خطرناک بموں کے تجربے بھی کئے جا رہے ہیں ۔

ان تجربوں کی سب سے بڑی وجہ وہ خوفناک رجحان ہے جو ایک ترقی یافتہ قوم کو دوسری ترقی پسند قوم پر سبقت لے جانے کی دعوت دیتا ہے ۔ غور کیجئے کہ ایسی مسابقت کو بھی مستحسن کہا جا سکتا ہے جو بے شمار انسانی زندگیوں کو معرض خطر میں ڈال دے ۔ سائنسی تجربات ' اگر جذبہ مسابقت کے دائرہ میں آ گئے تو اس سے دنیا کی تباہی ایک یقینی امر ہے ۔ یہ سائنس ، تابناک ذہنوں کی پیداوار ہے ایسے ذہنوں کا توازن برقرار رہنا بڑا ضروری ہے ۔ ورنہ ان اذہان کی یہ تابناکی بین الاقوامی زندگی کو موت کے تاریک غاروں میں دھکیل دے گی ۔

سائنس کے ارتقا نے پوری زندگی کو بدل کر رکھ دیا ہے ۔ انسانی سوچ کے انداز تک بدل چکے ہیں ہر کام میں "برق رفتاری" کا جوہر داخل ہو چکا ہے ۔ پہلے جو کام انسانی ہاتھ کرتے تھے اب وہ کام مشینوں سے لئے جا رہے ہیں ۔ ہاتھ کی انگلی صرف ایک بٹن کو دباتی ہے اور مشین حرکت میں آ جاتی ہے ۔ پتھروں کے ٹکڑے سیمنٹ میں تبدیل ہو جاتے ہیں ۔ لوہا اور فولاد موم کی طرح پگھلنا شروع ہو جاتا ہے ۔ لکڑیوں کے شہتیر دیکھتے ہی دیکھتے متعدد تختوں میں کٹ کر تقسیم ہو جاتے ہیں ۔ چٹانیں گاجر مولی کی طرح کٹ جاتی ہیں ۔ زمین کی تہیں ایک مختصر وقفہ میں تہہ و بالا ہو جاتی ہیں ۔ بہتا ہوا پانی جم جاتا ہے اور برف کی یخ بستہ سلیں ۔۔۔ پانی ہو جاتی ہیں ۔ اس مشین نے پھیلے ہوئے کام کو سمیٹ کے رکھ دیا ہے ۔ وقت کو

قابو میں لانا ایک ناممکن کام تھا۔ لیکن سائنس نے اس ناممکن کام کو بھی بڑی سہولت سے ممکن بنا دیا ہے۔

سائنس کی یہ سہولت بجا۔ لیکن ان سہولتوں نے ایک بہت بڑا نقصان بھی پہنچایا ہے۔ مشین کے بٹن نے انسان کو سہل انگار بنا دیا ہے انفرادی قوت تو قریباً ختم ہوتی جا رہی ہے۔ سائنسی ایجادات نے جس قسم کے آرام دہ ماحول کو تخلیق کیا ہے اس ماحول میں رہ کر انسان کا آرام طلب ہو جانا ایک یقینی بات ہے۔ ہر چند یہ سب کچھ انسان کی سہولتوں ہی کی خاطر ہوا ہے لیکن ان سہولتوں کا یہ مقصد تو نہیں ہے کہ انسان کو ہی سہل انگار بنا دیا جائے۔ ان سہولتوں کا تو یہ مقصد ہے کہ انسان کو زیادہ سے زیادہ وقت ملے اور وہ اپنے قومی معاملات کے بارے میں بہتر قسم کی سوچ بچار کر سکے۔

سائنس کے موجودہ خوفناک تجربات نے ایک ایسی فضا پیدا کر دی ہے۔ جس میں خوف و ہراس کے بھوت ناچ رہے ہیں۔ زندگی پر سے انسان کا اعتماد اٹھتا جا رہا ہے۔ ایسے مہلک ترین ہتھیار ایجاد ہو چکے ہیں جو آن واحد میں لاکھوں آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار سکتے ہیں سائنس کے فوائد مسلمہ ہیں۔ لیکن پہلا نقصان یہ ہوا ہے کہ مشین نے انسان کو سہل انگار بنا دیا ہے اور دوسرا نقصان یہ ہوا ہے کہ سائنس کے نئے تجربات نے قوموں کے ذہنوں میں خوف ہراس پیدا کر دیا ہے۔ سہل انگاری اور خوف ہراس دو ایسے سنگین زہر ہیں جو قوموں کی ہلاکت کا باعث ہوا کرتے ہیں۔

عالمی بساط پر ابھی تک کئی ایسے مسائل ہیں جو برسوں سے نزاع کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ اور اس بات کا اندیشہ ہر وقت لگا رہتا ہے۔ کہ کسی بھی وقت کوئی مسئلہ اس قدر سنگین صورت اختیار کر جائے کہ جنگ ناگزیر ہو جائے۔ اور اس امر کا یقین

دنیا کی ہر قوم کو ہے کہ اگر جنگ چھڑ گئی تو یہ جنگ اس ارضی کائنات کی آخری جنگ ہو گی۔ اسلحہ کی دوڑ میں دنیا کی دو بڑی طاقتیں ایک دوسرے سے بڑھنا چاہتی ہیں۔ اس لئے اس قسم کے مہلک ہتھیاروں کی جنگ کا دوسرا نام دنیا کا خاتمہ ہے اس قسم کے حالات میں کون انسان ہے جو دنیا کی بقا کے بارے کچھ سوچ سکتا ہے۔ سائنس نے زندگی کو آسائش کی ہر دولت عطا کی ہے۔ لیکن اس دولت کے ساتھ سہل انگاری، بے اطمینانی اور خوف وہراس کے نشتر جو اس کے پہلو میں اتار دیئے ہیں وہ اسے کہاں چین لینے دیں گے۔

ہم بڑے فخر سے یہ کہتے ہیں کہ ہمارا زمانہ سائنس کا زمانہ ہے ایجادات اور ترقی کا زمانہ ہے۔ روشنی اور عروج کا زمانہ ہے لیکن جونہی ہم ان خطرات کا موازنہ نئے زمانے کی سہولتوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ تو ہمیں خطرات کا پلڑا بھاری دکھائی دیتا ہے ساری دنیا "ایٹم برائے امن" کا نعرہ لگا رہی ہے لیکن اندرون پردہ جو کچھ ہو رہا ہے جیسے جیسے خوفناک اور مہلک ہتھیار تیار کیے گئے ہیں۔ انہیں دیکھ "ایٹم برائے امن" کے نعرے کی ساری حقیقت کھل جاتی ہے۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ تمام نعرے محض ایک دکھاوا ہیں ورنہ ترقی یافتہ اقوام کی یہی کوشش ہے کہ وہ جدید اسلحہ کی دوڑ میں ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں۔

وہ ملک جنہوں نے سائنس کے میدان میں بہت زیادہ ترقی کی ہے وہ ایٹمی طاقت کے تجربوں سے دوسری قوموں کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ اور ان تجربات ہی کے ذریعے وہ دوسرے ملکوں سے اپنی طاقت کا لوہا منوانا چاہتے ہیں۔ یہی نظریہ قریباً ہر ترقی پسند ملک کا ہے وہ خوفناک تجربات سے دنیا کو دہشت زدہ کرنا چاہتا ہے۔ اور یہ چاہتا ہے کہ دوسرے ممالک اس کی بالادستی کا اعتراف کریں۔ لیکن یہ کوئی اچھی مثال نہیں ہے اس سے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ "ایٹم

برائے امن" تو ایک دھوکا ہے۔ اصل مقصد تو یہ ہے کہ دنیا کے اس پلیٹ فارم پر ہر ملک یہ خواہش رکھتا ہے۔ کہ وہ موجودہ دور میں اپنی برتری ثابت کرے۔ اس جنون نے مہذب اور ترقی یافتہ ملکوں کو بھی گمراہ کر دیا ہے۔ سائنس کو ایک نور کی ندی بنانا چاہیے۔ اسے اندھیروں کا پہاڑ بنانا بہت بڑی حماقت ہے۔

ایٹمی تجربات کے خلاف آواز اٹھائی گئی تھی اور یہ احتجاج بڑی شد و مد کے ساتھ کیا گیا تھا۔ ان تجربات سے انسانی نسل کو جس قدر عظیم نقصان پہنچنے کا احتمال ہے اس بارے میں بھی بارہا اظہارِ خیال کیا جا چکا ہے لیکن نہ جانے مسابقت کے جذبہ نے بعض ملکوں کو کیوں اس قدر دیوانہ بنا رکھا ہے کہ وہ لاکھوں روپیہ کے صرفہ سے ایٹمی تجربہ کر رہے ہیں حالانکہ یہی روپیہ انسانی فلاح و بہبود کے لئے خرچ کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ دور میں اسلحہ کی دوڑ کو بند کر دینا از حد ضروری ہے۔ ایٹم کو حقیقی معنوں میں انسانیت کی بقا امن کی حفاظت اور نسل انسانی کی بہتری کے لئے استعمال میں لانے کی ضرورت ہے۔ سائنسدانوں کی سطح پر ہمیشہ اس خیال کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ان کی ایجادات خدا کی زمین پر امن و سلامتی کی پیغامبر نہیں — قیامتیں برپا نہ کریں۔ جہاں تک زمینی پیداوار کا تعلق ہے سائنس نے کافی سے زیادہ معاونت کی ہے۔ سائنسی آلات نے زمین کی تہوں کو کھنگال ڈالا ہے۔ وہ زمینیں جو کاشتکاری کے قابل نہیں تھیں۔ انہیں قابل کاشت بنایا گیا ہے بہرسانی کے سلسلے میں بھی سائنس نے بڑی مدد کی ہے۔ وہ جانور جن کا تعلق زمین بونے سے ہے سائنسی آلات نے ان جانوروں کا کام بھی دیا ہے زمین صحیح معنوں میں سائنس کی ایٹمی برکتوں سے مستفید ہوئی ہے لیکن ان تجربات کا کیا علاج جنہوں نے ہماری زندگی کی فضا میں زہریلی شعاعیں پھیلا دی ہیں ایسے تجربات کو قطعی بند کر دینے کی ضرورت

ہے۔ اس وقت تو وہی ملک دنیا کے ممالک کی نمائندگی کر سکتا ہے جس کا نصب العین انسانیت کی خدمت و حفاظت ہو۔ جو اس بات کا آرزو مند ہو کہ دنیا کی ہر قوم اپنی اپنی زندگی کے دائرہ میں ترقی پذیر رہے۔

زمین آج بھی سائنس کے احسانات کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے۔ انسان بھی سائنس کی نوازشات کا مرہون منت ہے۔ اب ان احسانات اور نوازشات کا بھرم تبھی قائم رہ سکتا ہے کہ سائنسدان خوفناک تجربوں سے دنیا کے امن کو تباہ و برباد نہ کریں۔ وہ ان تجربات سے اجتناب کریں۔ جو نسل انسانی کی ہی بیخ کنی کا موجب ہو سکتے ہیں۔ سائنس واقعی زندگی کی روشنی ہے اور اسے زندگی کی روشنی ہی رہنا چاہیئے۔ اگر مسموم تجربات اس روشنی کو تاریکی میں بدل دیں تو یہ انسانی فکر کی کس قدر شدید بدقسمتی ہے۔

ایٹمی دور نے انسان کے ذہن اور حواس پر جس قسم کا اثر ڈالا ہے باوجود ایک خوشگوار تصور کے اس اثر نے عام زندگی میں ایک بے چینی سی پیدا کر رکھی ہے۔ سائنس کی اس بلندی کے ساتھ ذہنی ارتقا کا بھی اظہار ہوتا ہے لیکن اس ذہنی ارتقا میں ضبط و تحمل کا ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ ارتقا اگر تدبر اور صحیح انسانی فکر سے محروم ہو گیا۔ تو ظاہر ہے کہ انسان کا یہ ذہنی ارتقا۔۔۔ انسان کی سب سے بڑی پستی کا موجب بھی بن سکتا ہے۔ مہلک ہتھیار بنانے کی بجائے اگر ایسا ساز و سامان تیار کیا جائے جو انسان کی صحت و توانائی اور عقلی توازن کا محافظ ہو تو نسل انسانی پر ان سائنسدانوں کا یہ بہت عظیم احسان ہوگا۔ جو مسموم قسم کے ایٹمی تجربات کرنے میں مصروف ہیں۔ انہیں انسان کی فلاح کی خاطر ان تجربات کو قطعی طور پر ترک کر دینا چاہیئے۔

دنیا کی ہر قوم طبعاً امن پسند اور عافیت کوش ہے۔ وہ تعمیر و ترقی کی

بھی خواہاں ہے اور اس ضمن میں اسے جہاں کہیں سے بھی مدد ملے وہ اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ امداد سیاست سے ملے یا سائنس سے۔ یا کسی اور ذریعہ سے۔ ہر قوم اس امر کی متمنائی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے شب و روز کو ہر قسم کی اندرونی و بیرونی الجھنوں سے آزاد رہ کر گزارے۔ لیکن موجودہ ایٹمی تجربات کے دور میں یہ تمنا کس بُری طرح مجروح ہو رہی ہے۔ ہر شخص اس خوفناک جراحت سے بخوبی واقف ہے۔ کوئی قوم بھی بے کلی سے خالی نہیں ہے۔ وہ قوم جو خود ایسے تجربات کر رہی ہے ان تجربات کے مضر اثرات سے وہ اپنے آپ کو بھی محفوظ خیال نہیں کرتی۔ لیکن کم بخت تجربات ہیں کہ ہو رہے ہیں۔ مسموم اثرات ہیں کہ پھیل رہے ہیں۔ آواز اٹھائی جاتی ہے۔ مذمت کی جاتی ہے لیکن حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ کسی نہ کسی طرف سے ایٹمی تجربوں کا اعلان ہوتا ہی رہتا ہے۔

ہر چند ہم لوگ ابھی تک سائنس کی روشنی سے بہت دور ہیں جہاں دنیا کے ممالک اس فن میں ہو شہر یا قسم کی ترقی کر رہے ہیں۔ وہاں ہم لوگ اس اعتبار سے ابھی تک "پس ماندہ" ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں سائنس کی فنی تعلیم دینے کے ادارے نہ ہونے کے برابر ہیں اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارا ملک ایک زرعی ملک ہے یہاں سائنس سے زیادہ زمین ہماری توجہ کا باعث ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سائنسی فقدان کے سبب ہم سائنس کی تعلیم حاصل کرنے سے کوئی رغبت نہیں رکھتے۔ ہمیں اس شعبہ سے بھی رغبت ہے۔ لیکن بعض مجبوریوں کی بنا پر اس کا حصول ہمارے لئے دشوار ہو گیا ہے۔ ان حالات کے تحت یہ کس قدر نامناسب بات ہے کہ ہم لوگ سائنسی کی روشنی سے تو دور رہیں لیکن اس کے خوفناک تجربات کے شکار ہونے کا اندیشہ ہر وقت لاحق رہے۔ موجودہ دور میں سائنسی تجربات نے جو مفہوم اختیار کر لیا ہے۔ اس مفہوم

نے ہمارے ذہنوں میں ایک ایسا خوف تخلیق کر دیا ہے کہ یہ اڑتے ہوئے راکٹ ہمیں موت کے آتشیں تیر معلوم ہوتے ہیں۔

اس حقیقت سے دنیا کا ہر فرد آشنا ہے کہ مشیت نے معیشت پر زندگی کا انحصار رکھا ہے ۔۔۔ زمین ۔۔۔ دنیا کے ہر انسان کو غذا دیتی ہے یہ غذا آسمان سے نہیں اترتی بلکہ انسان اسے اپنے ہاتھوں سے زمین کا سینہ چیر کر پیدا کرتا ہے۔ صحت مند آب و ہوا ۔۔۔ اچھا پانی ۔۔۔ غذا میں اضافے کا موجب ہوتا ہے لیکن وہ بات جس سے بے حد صدمہ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ایٹمی تجربات نے پوری زمین کو اپنے زہریلے اثرات سے تباہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان اثرات سے آب و ہوا تو بالکل خراب اور ضرر رساں ہو کر رہ گئی ہے۔ جب پوری فضا ایٹمی تجربات کے زہریلے اثر کی گود میں ہے تو اس زمین اور زراعت کے وسائل کا متاثر ہونا ایک یقینی امر ہے۔ اب ایسے تجربات سے کیا فائدہ ہے جو اس دیوار کو گرا رہے ہیں۔ جن پر زندگی کا انحصار ہے۔

اس وقت نئے نئے تجربات نے عالمی سلامتی کے لئے بڑی نازک صورت حال پیدا کر دی ہے۔ دنیا کے مدبروں کو اس صورت حال پر غور کرنا چاہیئے۔ اب یہ بات تو مشکل ہے کہ سائنس کی بڑھتی ہوئی رفتار کو روکا جائے۔ صرف یہی کچھ کہا جا سکتا ہے کہ سائنسدانوں کو اس امر پر مجبور کر دیا جائے کہ وہ ایسے تجربوں سے دستبردار ہو جائیں۔ آخر وہ بھی تو اسی کائنات کے انسان ہیں۔ جب ان کی سائنس کے تجربوں کے سبب، کئی انسان ہلاک ہو چکے ہیں تو کیا ایک انسان کی حیثیت سے وہ یہ نہیں سوچ سکتے کہ زندگی کو اس قدر ارزاں نہیں کر دینا چاہیئے۔ اسے زندگی کا محافظ اور سچا دوست بنانے کی ضرورت ہے۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم ایسے خوفناک ایٹمی تجربوں کو فوراً ختم کر دینا چاہیئے جو آج نہ صرف انسانی جانوں

کو غارت کر رہے ہیں بلکہ فضا کو زہریلا بنا رہے ہیں اور زندگی کو خوف وہراس اور بے اطمینانی کا شکار بنا رہے ہیں۔ پوری دنیا پر سائنس اپنا تسلط جما چکی ہے۔ ہر ملک اس کے "ناگہانی تجربوں" سے بلبلا اٹھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے قربِ قیامت کے آثار پیدا ہوتے جارہے ہیں اور دنیا تباہی کے دھانے پر آکھڑی ہوئی ہے۔ اگر عالمی طور پر ان مہلک تجربات کو بند نہ کیا گیا تو یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے کہ فضا میں موجود تابکاری اثرات انسانی نسل ہی کو صفحہ ہستی سے مٹا دیں ـــــ مسابقت کے جذبہ کو دلوں سے باہر نکال دینا چاہیئے اور سائنس کو زمین اور انسانی کے لئے اس طرح استعمال کرنا چاہیئے کہ نسل انسانی کی بقا کا پہلو مخدوش نہ رہے۔

---

# دوست اور اس کا انتخاب

دوست ایک بہت پیارا لفظ ہے، محبت سے بھرا ہوا شیریں۔ دلکش اور دل و دماغ کے خفیہ طوفانوں میں ہلچل مچا دینے والا۔ دوست کی صفات جو ہمارے شعور اور دماغ میں ہوتی ہیں ان میں سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ مخلص ہو۔ اس کا خلوص بے لوث اور بے باک ہو۔ وہ دوست کی بہتری کو اپنی ہر ذاتی غرض سے مقدم رکھے۔ ہر قدم، ہر نہج اور ہر مرحلے پر اس کی خواہشات کو اپنی خواہشات بلکہ ضروریات پر ترجیح دے۔ اپنے خیالات کو بغیر تعصب وتنگ نظری اور بلاحیل وحجت اس کے خیالات سے متوازن کرے۔ یا اسے اپنا بنا لے یا خود اس کا بن جائے۔ غم میں غمگساری کرے۔ خوشی میں شریک ہو۔ دوست زخمی ہو تو یہ مرہم بن جائے۔ وہ کمزور ہو تو یہ طاقت بن جائے۔ مایوسی میں حوصلہ بندھائے۔ بیماری میں تیماردار ہو۔ اور اگر مریں تو نوحہ خواں رہے۔ نئے اور پرانے شعراء کے دلوان دوست کے لفظ سے بھرے پڑے

ہیں۔ مفکرین اور مدبرین بھی یہی کہتے رہے ہیں کہ جسے دنیا میں ایک بھی باوفا دوست مل گیا۔ وہ خوش قسمت انسان ہے۔ اور ذوق کا یہ شعر تو سکۂ رواں رہا ہے اور رہے گا۔

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

انسان کے لئے سچے دوست سے بہتر کوئی سرمایہ نہیں۔ کسی نے کتنی دل نشین بات کہہ دی ہے کہ "اگر پر مسرت زندگی گزارنے کے لئے مجھے چند چیزوں کے انتخاب کا اختیار دیا جائے تو میں صرف ایک چیز مانگوں گا۔ اور وہ ہے ایک دوست! جو لفظ دوست کے حدود و قیود کے پیش نظر مکمل دوست ہو" کتنی جامع ہے یہ خواہش! کتنا مکمل ہے یہ انتخاب۔ درحقیقت سچا اور بے غرض دوست ہمیں علم و دولت سے بڑھ کر کامیاب بنانے اور خوش رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ دنیا میں بے انتہا آدمی ایسے ملیں گے جو کبھی منزل مقصود پر نہ پہنچتے اگر ان کے دوست وقتاً فوقتاً انہیں ہمت نہ دلاتے رہتے اور تکلیفات و مشکلات میں ان کی مدد نہ کرتے۔ تاریخ کثرت سے ایسی مثالیں پیش کرتی ہے۔ بڑے بڑے لوگوں کی نجی، سیاسی، معاشرتی اور معاشی زندگی کا اگر تعمق نگاہی سے جائزہ لیں تو ان کی بڑائی کے پیچھے ہمیشہ چند گمنام اور غیر معروف شخصیتیں کام کرتی نظر آئیں گی۔ پس پردہ ہمیشہ کچھ ایسے لوگوں کا حصہ ہوگا جن کے بغیر یہ بڑے لوگ عظمتوں سے بے بہرہ رہتے۔ کامیابیوں سے ہمکنار نہ ہوتے۔ اور وہ کچھ نہ ہوتے جو کچھ مانے گئے ہیں۔ بڑے لوگوں کا اگر کچھ استحقاق ہے تو اتنا کہ انہیں کام لینا آتا تھا۔ ان میں حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے مناسب اوزار اور معمار جمع کرنے کی صلاحیتیں موجود تھیں۔ اگرچہ یہ استعداد

بھی کسی کسی کو ودیعت ہوتی ہے۔

ایمرسن کا قول ہے کہ زندگی میں سب سے بڑھ کر اس بات کی ضرورت ہے کہ ہمیں کوئی ایسا آدمی ملے جو ہم سے وہ کام کرائے جس کے کرنے کی طاقت ہمارے اندر موجود ہے۔ اور یہ ایک دانا دوست ہی کا کام ہے۔ کیونکہ وہ ہماری طاقتوں کا صحیح اندازہ کر لیتا ہے اور ہماری خوبیوں کو سمجھ لیتا ہے۔ وہ ہمارے لئے زندگی کے دروازے کھول دیتا ہے۔ ہم ایک دوسرے کی باتیں بلا کہے سمجھ جاتے ہیں ـــــ اور یہی حقیقی سوسائٹی ہے جس کی ہمیں ضرورت ہے۔

بعض اوقات رنج و الم، شکوک، مایوسی دل کو ایسے بے طرح دباتے ہیں کہ زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ حیات اک مستقل غم کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتی۔ بے بسی مجسم ہو کر فکر و کردار پر مسلط ہو جاتی ہے اور خیالات وعزائم ابھرنے سے پہلے ڈوب جاتے ہیں۔ انسان ایسی صورت میں قیودِ زمان و مکان سے گھبرا کر آب و گل کی دیواریں توڑنے اور منزلِ آخر کی جانب فرار اختیار کرنے کے منصوبے باندھ لیتا ہے۔ لیکن اس وقت دل کی گرہ ایک ہمدرد دوست ہی کھول سکتا ہے۔ جسے غم کی کہانی سنا کر ہم دل کا بوجھ ہلکا کر سکتے ہیں۔ کھوئے ہوئے راستوں کو تلاش کر کے، نیا اور بہتر سفر اختیار کر کے، زندگی کے خطرناک موڑوں سے گزر کر مقصودِ زیست حاصل کر سکتے ہیں۔

دوست کے انتخاب میں نہایت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ جلد بازی یہاں مہلک ہوتی ہے۔ جب ہم معمولی معمولی چیزوں کے انتخاب میں جن کا اثر ہماری زندگی پر بہت کم پڑتا ہے۔ اس قدر غور و خوض کرتے ہیں تو دوست

کے انتخاب میں جس کا اثر ہماری زندگی پر نیکی یا بدی کے لئے بہت گہرا اثر پڑتا ہے، اس سے بھی زیادہ چھین بین کرنی چاہیئے اچھی جانچ پرکھ سے کام لینا چاہیئے۔ کیا اس سے بڑھ کر کوئی نادانی ہو سکتی ہے کہ ہم دوست کے انتخاب کو محض اتفاق پر چھوڑ دیں۔

یہ نہائت عمدہ بات ہے کہ ہم ان سب کے ساتھ جن سے ہم کو تعلق پڑے اخلاق اور مہربانی سے پیش آئیں۔ ان کی دستگیری اور راہنمائی کریں۔ لیکن ان سب کو دوست بنا لینا یا سمجھ لینا تو اس سے بالکل علیحدہ بات ہے۔ بعض ہر اس آدمی کو جو ان کے قریب رہتا ہو دوست بنا لیتے ہیں یا بنانے کی کوشش کرتے ہیں اس سے بڑھ کر اور کیا حماقت ہو سکتی ہے۔

دوستی کے لئے صرف اس شخص کا انتخاب کرنا چاہیئے جو ذہین ہو، آزاد طبع اور بہادر ہو۔ جس کے دامنِ پاکیزگی پر گناہ کا کوئی بدنما داغ نہ ہو اور زندگی کی کشمکش میں ہمارا ساتھ دینے والا ہو۔ مشکلات میں ہمیں تنہا نہ چھوڑ جائے۔ اپنی رائے رکھتا ہو۔ اور جن اوصاف سے متصف نہ ہو، بڑی فراخدلی سے ان کے فقدان کا اعتراف کرے۔ الغرض جو ہمارا بھائی ہو اور جس کے لئے ہمارے دل میں محبت کے پاک جذبات موجزن ہوں۔

دوست کا فرض ہے کہ وہ ہمارے نقائص سے ہمیں آگاہ کرتا رہے۔ اگر ہم صحیح معنوں میں انسان بننے کے خواہشمند ہیں تو ہمیں اپنے عیوب سے واقف ہونا چاہیئے۔ خود اپنے عیوب سے واقف ہونا بہت مشکل کام ہے۔ یہ کام صرف ایک ہمدرد دوست ہی کر سکتا ہے۔ ہاں جب کبھی اپنے دوست کا عیب ظاہر کرنا ضروری سمجھو تو نہائت نرمی سے گفتگو کرو۔ اور تخلیے میں جا کر اُسے اس کے نقص سے آگاہ کرو۔ کیونکہ جو کچھ تخلیے میں کہا جاتا ہے وہ

عمدہ سپرٹ میں لیا جاتا ہے ۔ اور ہمدردی پر محمول کیا جاتا ہے ۔ اور سمجھا جاتا ہے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ محض خیر خواہی کے لئے ہے ۔ اس کے برعکس جب کبھی آپ کو جائز طور پر تعریف کرنے کا موقع ملے تو سب کے روبرو کریں ۔ اس سے آپ کے دوست کی حوصلہ افزائی ہوگی ۔ لیکن یہ خیال رہے کہ بے تکلفی آپ کو ہرگز یہ اجازت نہیں دیتی کہ اپنے دلی دوستوں کو تلخ اور سخت باتیں کہہ لیا کریں ۔ بلکہ جس قدر دوستی پختہ اور گہری ہو، اس قدر مروت اور لحاظ کا زیادہ خیال رکھنا چاہیئے ۔

عمدہ دوست کا انتخاب کرنا نہایت مشکل کام ہے ۔ لیکن دوست کے ساتھ نباہ کرنا اس سے مشکل تر ہے ۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آپ کو اپنے دوست سے کوئی نہ کوئی شکایت پیدا ہوتی رہتی ہے ۔ جب ایسا معاملہ ہو تو صبر اور عقل سے کام لیں ۔ اس معاملہ کو اپنے دوست کے زاویہ نگاہ سے بھی دیکھیں ۔ اپنے دوست کے ساتھ بگاڑ کرنے میں جلدی نہ کریں ۔ انتظار کریں، ممکن ہے وقت پا کر آپ کا غصہ خود بخود کم ہو جائے ۔ یا دوست کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے ۔ تلخ نتائج کی اور دور رس کڑواہٹ سے دونوں فریق محفوظ ہو جائیں ۔ تحمل اور درگزر کرنے اور معافی مانگنے اور دینے کے لئے ہر وقت مستعد رہیں اور پیش بندی کو اپنا شعار بنائیں ۔ کیونکہ غلطی کا سرزد ہونا تقاضائے بشریت ہے ۔ آج اگر آپ کے دوست سے غلطی سرزد ہوتی ہے تو ممکن ہے کہ کل آپ اس سے بھی بڑی غلطی کا ارتکاب کر لیں ۔ کیا آپ یہ نہیں چاہیں گے کہ آپ کا دوست آپ کی غلطی کو خواہ وہ کسی بھی نوعیت کی ہو، نظر انداز کر دے؟

اپنے دوستوں کے ساتھ نباہ کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تم ان کی خوبیوں ہی کو مدنظر رکھو ۔ ان کے نقائص کو سامنے نہ لاؤ ۔ پھول کی دلکشی اسی

یں ہے کہ آپ کانٹوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں - اب آپ کی انگلیاں لہولہان بھی ہو جائیں تو اسے گوارا کر لیتے ہیں کیونکہ پھول کی لطافت ضرورت سے زیادہ تلافی کر لیتی ہے۔ آخری بات جو میں اس زمرہ میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً اپنے دوست سے ملاقات کرتے رہیں۔ کیونکہ وہ راستہ جس پر کوئی نہ چلے خاردار ہو جاتا ہے۔

---

# ہندو قوم کی ذہنیت

اس امر سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا کہ تمام انسان ایک ہی طرح پیدا ہوتے ہیں، پرورش کے فطری تقاضے بھی یکساں ہیں، جوان اور بوڑھے ہو کر بھی ایک ہی طرح کے بنیادی مسائل اور ذمہ داریوں سے واسطہ پڑتا ہے اور بالآخر سب ہی موت کا مزا چکھتے ہیں۔ ان حقائق پر کتنا ہی اور کسی بھی زاویۂ نگاہ سے غور کیا جائے صرف ایک ہی بات سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ تمام انسان بلا لحاظِ مذہب و ملّت کسی ایک اعلیٰ و ارفع طاقت کی مخلوق ہیں کیونکہ اگر مختلف ممالک کے لوگوں کو پیدا کرنے والی ہستیاں بھی کئی یا الگ الگ ہوتیں تو لازماً دنیا میں انسانوں کی مختلف الانواع پیدائشوں، شکلوں اور بنیادی تقاضوں کا ظہور ہوتا چنانچہ سب لوگ اس اعلیٰ و ارفع ہستی کو خالق تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے اور اسی تسلیم و رضا کا بیّن ثبوت اللہ، خدا، ایشور، پرماتما، گاڈ وغیرہ نام تمام انسانوں کے ذہن میں ہر عجز و انکساری کے موقع پر ابھر

آتے ہیں اور تمام اس واحد و برتر ہستی کے سامنے جھکنے اور اس سے ڈرنے کا فطری جذبہ اپنے اندر رکھتے ہیں۔

پھر انسانی ہمدردی کا فطری مادہ بھی ہر انسان میں پایا جاتا ہے۔ اگر راہ چلتے کوئی حادثہ آپ کے سامنے ہو جائے تو آپ کو یہ فکر نہیں سوجھتی کہ پہلے پوچھ لیں کہ کون اور کس مذہب وملت سے تعلق رکھنے والا حادثے کا شکار ہوا ہے بلکہ آپ فوراً آگے بڑھتے ہیں اور انسانی جانوں کو بچانے کے لئے جو کچھ آپ سے بن پڑے اس سے آپ دریغ نہیں کرتے، انسان تو انسان کسی حیوان کو بھی اگر چوٹ آجائے تو آپ کی ہمدردی جوش میں آجاتی ہے اور آپ جلدی سے اس کی مدد اور علاج میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ کسی مرگ والے گھر کی آہ وفغاں کے پاس سے گزریں اور آپ کی آنکھیں آبدیدہ نہ ہو جائیں یا آپ کا دل نہ بھر آئے۔ آپ کسی ہسپتال میں جائیں، مریضوں کے پاس سے گزریں اور آپ کے چہرے سے نکھار اور بشاشت ٹپکتی ہو، یہ کیسے ممکن ہے؟ کون ہے جو ان حقائق سے انکار کرے اور سینے پر ہاتھ مار کر یہ دعوی کرے کہ اس کا دل انسانی محبت وہمدردی سے بالکل خالی ہے، دنیا کو آگ لگ جائے، لوگ بھاڑ میں جائیں، اسے کسی سے کچھ غرض نہیں؟ کسی ایک سے نفرت اور چند اشخاص سے دشمنی کی وجہ جواز عدم جذبۂ ہمدردی ہرگز نہیں ہوا کرتی بلکہ وہ ایک وقتی اور ذاتی رنجش کا نتیجہ ہوتی ہے جو بہرحال مصالحت، عفو اور درگزر کے سانچوں میں ڈھل کر پھر سے انسانی ہمدردی اور رشتۂ اخوت کا پیکر اختیار کرنے کا امکان ضرور رکھتی ہے یہ صرف اس لئے کہ انسان رحم ومحبت کا پتلا ہے، ہمدردی کرتا ہے اور ہمدردی چاہتا ہے اور اگر بالفرض مجبوری حالات کی بنا پر وہ انسانی

ہمدردی کو خیرباد کہہ بھی دے تو اس وقت تک اسے چین وسکون نہیں ملتا جب تک کہ وہ دوبارہ انسانی محبت و ہمدردی کو دل میں جگہ نہ دے لے۔ انسان بلاتمیز مذہب و ملت ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور سوائے جذبۂ ہمدردی کے کوئی دوسری چیز اُن کو یوں جوڑ نہیں سکتی۔

جہاں تک مذہب اور دین کا تعلق ہے وہ ایک طریقِ زندگی کا نام ہے مذہب اپنے مخصوص نظریات اور اصول وضوابط انسان کے سامنے واضح طور پر رکھ دیتا ہے۔ اور سوچ سمجھ کر اس کو اپنانے (ایمان لانے) کی دعوت بھی دیتا ہے لیکن مجبور نہیں کرتا کہ وہ ضرور اس کے تحت زندگی گزارے۔ انسان کو اس معاملہ میں کھلی چھٹی ہے کہ وہ اپنی مرضی اور منشار سے کسی بھی طریقِ زندگی کو اختیار کرلے۔

دنیا کے کسی بھی مذہب میں یہ قانون نہیں پایا جاتا کہ وہ زبردستی پکڑ پکڑ کر اور سر پر تلوار رکھ کر کسی کو مجبور کرے کہ وہ اس مذہب کو اختیار کرے ورنہ اس کی گردن تن سے جدا کردی جائے گی۔ اگر یہی بات ہوتی تو دنیا کے کسی حصے میں بھی انسان سکھ اور چین کی زندگی نہ گزار سکتا بلکہ معاملہ یہ ہوتا کہ ہر جگہ لوگ لٹھ لے کر کھڑے رہتے اور ہر آنے والے اور گزرنے والے شخص سے دریافت کرتے کہ بتاؤ تم نے فلاں مذہب کیوں اختیار کر رکھا ہے اور ہمارا مذہب پسند کیوں نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی مذہب میں یہ سختی نہیں کہ وہ دوسرے کو اسے اپنانے پر مجبور کرے اور نہ ایسا ہونا چاہیئے۔ یہی وہ اصول ہے جس کی بنا پر لوگ مختلف مذاہب اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اور ایک ہی خطہ ارض پر رہتے ہوئے بھی اپنے اپنے مذہب میں پورے طور پر آزاد ہیں اور انسانی

ہمدردی کا فطری جذبہ رکھنے کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے رحم، ہمدردی اور تعاون سے کام لیتے ہیں۔ لیکن جہاں ایک مذہب کے لوگ اُٹھ اُٹھ کر دوسرے مذہب کے لوگوں پر ظلم و ستم اور قتل و غارت شروع کر دیں وہاں دنیا کا کوئی شخص جو تھوڑی سی بھی عقلِ سلیم اور دیانتداری اپنے اندر رکھتا ہے یہ نہیں سوچ سکتا کہ ایک مذہب کے تمام لوگوں نے دوسرے مذہب کے تمام لوگوں کی توہین یا آبرو ریزی کی ہے اس لئے دوسرے مذہب والے سارے لوگوں کو حق پہنچتا ہے کہ وہ پہلے مذہب والے تمام لوگوں کو جہاں جہاں وہ ملیں قتل کر دیں۔ یا زیادہ بُرے طریقے سے آبرو ریزی کریں۔ ظاہر ہے اس طرح کا ہمہ گیر مذہبی اشتعال جسے عقل و دیانت سے دور کا بھی علاقہ نہ ہو صرف وحشت اور بربریت کے نام سے تو پکارا جا سکتا ہے مذہبی فلسفہ اور مصلحت نہیں کہلا سکتا۔

جب انسانی نگاہوں سے یہ اصول اوجھل ہو جائیں اور تعصب اور جانبداری ہی اوڑھنا بچھونا بن جائے تو اُس وقت مذہب کے نام پر نوعِ انسانی پر بے طرح ظلم ڈھائے جاتے ہیں۔ اس کی بدترین مثال ہندو ہیں۔ ان کا مخصوص تعصب جس کی بنیادیں اُن کے طرزِ معاشرت کلچر اور ثقافت میں گہری اُترتی چلی گئی ہیں۔ اس قدر اندھا ہے کہ دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کو اس کے ہاتھوں بہت زخم کھانے پڑے ہیں۔ غیر تو الگ رہے اُن کا اپنوں کے ساتھ جو سلوک رہا ہے وہ تعصب کا بدترین مظہر ہے۔ اچھوتوں اور نچلی ذاتوں پر برہمن جاتی نے جو ظلم کئے اُن سے تاریخ کے اوراق سُرخ ہیں۔ تقسیم کے وقت ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت مسلمانوں کا جو قتلِ عام کیا گیا۔ وہ انسانیت اور مذہب کے دامن پر ایک بدنما داغ ہے۔ اور اس کے بعد آج تک کے سولہ سال کے

عرصہ میں ہندوؤں نے بارہا اپنی اس بربریت کا مظاہرہ کیا ہے۔ جبل پور کے مسلمانوں پر مظالم بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھے۔

جبل پور (بھارت) کے فسادات میں مسلمانوں کا کیا قصور تھا اور ہندوؤں نے کیا کیا اور کتنے ظلم و ستم ان پر ڈھائے تھے اس حقیقت کی پوری تصویر کشی تو وہ بیانات کرتے ہیں جو جبل پور کے کمشنر مسٹر گپتا، لوک سبھا کے کانگریسی ارکان مولانا حفظ الرحمن اور ایک عیسائی رکن مسٹر انتھونی اور جبل پور سے بھاگ کر پاکستان (کراچی) آنے والے مظلوم مسلمانوں نے دیئے تھے۔ اور جنہیں میں یہاں بھی نقل کر رہا ہوں، لیکن اس سے پہلے وہ اصل بات بھی مختصراً سن لی جائے جو ان فسادات کا موجب بنی اور جس کی آڑ لے کر یہ ظلم و ستم ڈھائے گئے۔

جبل پور کی جس ہندو دوشیزہ کی عصمت دری کا الزام ایک مسلمان نوجوان کے سر دھر کر اس علاقے کے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی تھی، اس کے اصل حقائق اب منظر عام پر آ گئے ہیں، اس ہندو دوشیزہ کی عصمت دری کسی مسلمان طالب علم نے نہیں کی، بلکہ اس لڑکی کے دو ہم جماعت ہندو طلباء نے کی تھی، یہ طلباء اس دوشیزہ کی محبت میں گرفتار تھے، انہوں نے پہلے تو اسے عشقیہ خطوط اور فلمی اشعار سے رام کرنے کی کوشش کی لیکن جب ان کا کام نہ بنا تو انہوں نے اسے سینما چلنے اور پکنک وغیرہ کی دعوت دی۔ لیکن جب دوسری طرف سے دعوتوں کے لئے بھی انکار ہو گیا

تو انہوں نے اس دوشیزہ کے اغوا کا پروگرام بنایا۔
جس کا کسی طرح لڑکی کو پتہ چل گیا۔ اس نے پرنسپل
سے شکایت کی، اور اس کے ثبوت میں ان کے
خطوط وغیرہ پیش کئے۔ پرنسپل نے ان طلبا کے والدین
کو صورتِ حال سے مطلع کیا۔ انہیں جب اس کی اطلاع
ہوئی تو یہ گھر سے غائب ہو گئے۔ اس کے تیسرے
دن ان دونوں لڑکوں نے کالج ہوسٹل کے چوکیدار
کو رشوت دی اور کسی طرح لڑکی کے کمرے میں
گھس گئے۔ جہاں انہوں نے اس کی عصمت لوٹی اور
برہنہ حالت میں اس کی تصویریں لے کر چلتے بنے۔
لڑکی کے لئے چونکہ یہ صدمہ ناقابل برداشت تھا،
اس نے اپنے کپڑوں میں آگ لگا کر خودکشی کر لی،
اسے نیم بے ہوشی کے عالم میں ہسپتال پہنچایا گیا۔
جہاں اس نے عصمت دری کرنے والے طلبا کا نام بتایا،
ادھر ان مجرموں نے بڑی ہوشیاری سے یہ افوا پھیلا
دی کہ ایک مسلمان نوجوان نے ایک ہندو طالبہ کی عصمت
دری کی ہے ہندوؤں کو چونکہ اس طرح کے مواقع کی
تلاش رہتی ہے، سو انہوں نے اس سے فائدہ اٹھایا،
اور مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔
اب کمشنر جبل پور مسٹر گپتا کا بیان ملاحظہ ہو:۔
نئی دہلی - ۲۱ر فروری (اپ پ) جبل پور کے کمشنر

مسٹر گپتا نے بتایا ہے کہ جبل پور اور ساگر کے فرقہ وارانہ فسادات میں چار سو سے زیادہ گاؤں تباہ ہیں مسٹر گپتا نے کل جبل پور میں اخباری نمائندوں کو بتایا کہ فساد میں جبل پور کے ۲۹۲ اور ساگر کے ۱۱۳ گاؤں تباہ ہوئے لیکن جبل پور کے مقابلہ میں ساگر میں نقصان زیادہ ہوا ہے مدھیہ پردیش کے گورنر نے کل جبل پور کے فساد زدہ علاقہ کا دورہ کیا۔ اور لوگوں کو مل جل کر رہنے کی "تلقین کی"۔

لوک سبھا کے کانگرسی رکن مولانا حفظ الرحمٰن کا بیان بھی سنئے:۔

۲۲ فروری آج یہاں لوک سبھا میں کانگرسی رکن مولانا حفظ الرحمٰن نے بتایا کہ جبل پور کے فسادات ہندو غنڈوں نے کرائے تھے اور انہیں بعض سرکاری افسروں کی حمایت حاصل تھی۔ آپ نے مدھیہ پردیش کی انتظامیہ پر کڑی نکتہ چینی کی۔ ایوان میں موجود متعدد دیگر کانگرسی اور مخالف ممبروں نے بھی اس رائے کا اظہار کیا کہ اگر مقامی حضرات غفلت سے کام نہ لیتے تو جانی اتلاف بہت کم ہوتا۔ مولانا حفظ الرحمٰن نے کہا کہ جب کبھی بھارت کے مسلمانوں کے جائز حقوق کے تحفظ کی بات چیت کی جاتی ہے تو بعض لوگ فوراً پاکستان کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔ آپ نے اس رجحان کے بارے میں خبردار کیا۔ آپ نے کہا کہ جبل پور کے

فسادات اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی اقتصادی
حالت تباہ کرنے کے لئے کس طرح منظم اور جچی تلی
کوششیں کی گئی ہیں۔ آپ نے کہا کہ مسلمانوں کی اقتصادی
حالت اس سے ظاہر ہے کہ انہیں صوبائی اور مرکزی حکومتوں
میں کوئی ملازمت نہیں دی جاتی۔ آپ نے بھارت کی
وزارتِ تعلیم پر بھی نکتہ چینی کی اور کہا کہ اقلیتوں کو ایسی
کتابیں پڑھنے پر مجبور کیا جاتا ہے جو ان کے جذبات
مجروح کرنے والے مضامین پر مشتمل ہوتی ہیں۔

بھارتی لوک سبھا میں عیسائی رکن مسٹر انتھونی کا بیان بھی ملاحظہ ہو۔

نئی دہلی ۲۳ فروری (اپ پ) کل یہاں بھارتی لوک
سبھا میں ایک عیسائی رکن مسٹر انتھونی نے جبل پور کی پولیس
اور وہاں کے سیاست دانوں پر سخت حملے کئے،
آپ نے مسلمانوں کے قتل عام کی مذمت کرتے ہوئے
کہا کہ حالیہ فساد اچانک نہیں اٹھا تھا بلکہ مسلمانوں کے
قتلِ عام ان کی جائیدادوں کو نذرِ آتش کرنے اور
لوٹ مار کا منصوبہ پولیس اور سیاسی لیڈروں نے
پہلے سے بنا رکھا تھا۔ آپ نے کہا یہ فسادات کسی
الگ حادثہ کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ یہ بھی ہندوؤں
کے ان عزائم اور رجحانات کی ایک کڑی تھی جن
کی سارے ملک میں حوصلہ افزائی اور پشت پناہی
کی جاتی ہے۔ آپ نے دعوٰے کیا کہ جبل پور کے

فسادات پولیس اور سیاسی لیڈروں کی سازش کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہو سکتے تھے عیسائی لیڈر نے بتایا کہ جبل پور سے میرے دوستوں نے جو اطلاعات بھیجی ہیں ان میں کہا گیا ہے کہ پولیس خود لوٹ مار اور مسلمانوں کے قتل عام میں ہندو غنڈوں کے ساتھ شریک تھی۔ آپ نے کہا کہ اس ملک میں پولیس ناقابل اعتماد ہے۔ آپ نے بھارتی ہندوؤں کی مجرمانہ ذہنیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوؤں اور بھارتی حکومت کا یہی رویہ رہا تو اس ملک میں کوئی اقلیت بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔"

"مسٹر انتھونی نے مزید بتایا کہ جبل پور کے فسادات کی پشت پناہی وہاں کی ایک ہندو جماعت اور وہاں کے کانگرسی کر رہے تھے آپ نے کہا کہ میں ان کے نام نہیں بتانا چاہتا آپ نے فسادات کی تحقیقات کا خیر مقدم کیا لیکن اس کے ساتھ ہی کہا مجھے شک ہے کہ تحقیقات غیر جانبدارانہ نہیں ہو گی۔ کیونکہ پولیس کوئی گواہ سامنے نہیں آنے دے گی آپ نے بھارتی عدلیہ کے ممبروں پر بھی عدم اعتماد کا اظہار کیا"۔

اب آپ ان مظلوم مسلمانوں سے آنکھوں دیکھا حال سنئے جو جبل پور سے بھاگ کر کراچی (پاکستان) پہنچے تھے۔

"کراچی کے ایک روزنامہ کی اطلاع کے مطابق گذشتہ

چند دنوں میں جبل پور سے جو لوگ بھاگ کر کراچی آئے ہیں۔ اور جو وہاں مسلمانوں کے ہولناک قتل عام کے عینی شاہد ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ سرکاری ذرائع سے اس فساد کی جو خبریں شائع ہوئی ہیں ان سے وہاں کی اصل صورت حال کا اندازہ لگانا ممکن نہیں ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے۔ کہ اس فساد میں بارہ سو مسلمان شہید ہو گئے تھے اور تین ہزار سے زیادہ زخمی ہوئے تھے۔ دو سو مسلمان عورتیں اغوا کر لی گئیں اور ایک ہزار سے زیادہ مسلمان پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہوئے ان عینی شاہدوں کے بیان کے مطابق اس ہنگامہ میں پولیس کا رویہ انتہائی عجیب و غریب رہا پولیس نے چند ہندوؤں کو ضرور پکڑا لیکن اس کے ساتھ ہی ہندوؤں سے زیادہ مسلمان گرفتار کر لئے گئے۔ پولیس نے شہید ہونے والے مسلمانوں کی لاشیں ان کے وارثوں کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اس طرح صحیح طور پر یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ فساد میں کتنے مسلمان شہید ہوئے ایک مقامی لیڈر منشی فیض محمد اب تک لاپتہ ہیں ان کے بیٹے پر بھی گولی چلائی گئی لیکن وہ خوش قسمتی سے زندہ بچ گئے۔ اگرچہ سخت زخمی ہوئے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ بعض مسلمانوں عورتوں کو برہنہ کر کے سڑکوں پر چھوڑ دیا گیا اور ان کی آبروریزی کی گئی اور یہ سارا کچھ پولیس

اور ملیشیا والوں کی نظروں کے سامنے ہوا جبل پور شہر میں
دو بڑی اور آٹھ چھوٹی مسجدوں کو شہید کر دیا گیا تھا"!

آخر میں میں اپنی طرف سے تبصرہ یا خیال آرائی کرنے کی بجائے پھر اُن اصولی افکار و نظریات کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرواتا ہوں جو ان واقعات سے پہلے ہی بیان کر آیا ہوں تاکہ ان کی روشنی میں قارئین خصوصاً ہمارے بھارتی ہندو بھائی دیانتداری کے ساتھ غور کر کے یہ دیکھیں کہ معاملہ کی اصل نوعیت کیا تھی اور واقعات کا صحیح پس منظر کیا۔

جبل پور کے کمشنر مسٹر گپتا اور لوک سبھا کے کانگرسی رُکن مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم، عیسائی رُکن مسٹر انتھونی کے بیانات کا ملخص یہ ہے کہ جبل پور کے فسادات ہندو غنڈوں نے کروائے تھے اور ان کو سرکاری افسروں کی پشت پناہی اور حمایت حاصل تھی۔ نہ صرف یہ کہ فساد اچانک نہیں اٹھا تھا بلکہ مسلمانوں کے قتل عام، ان کی جائدادوں کو نذر آتش کرنے اور لوٹ مار کا منصوبہ پولیس اور سیاسی لیڈروں نے پہلے سے بنا رکھا تھا پولیس خود لوٹ مار اور قتل عام میں شریک تھی اور غنڈوں کا ساتھ دے رہی تھی۔ ہمدرد جماعتیں بالخصوص کانگرس ان غنڈوں کی پشت پناہی کر رہی تھیں اُن مسلمانوں کے بیانات سے جو پاکستان پہنچے ظاہر ہوا کہ فسادات کی خبروں کو باقاعدہ سنسر کیا گیا اور اطلاعات کو بیرونی دنیا کے سامنے غلط رنگ میں پیش کیا گیا۔ تمام تر مظالم پولیس اور ملیشیا والوں کی نگاہوں کے سامنے کئے گئے حکومت نے آزاد دنیا کی ملامت سے بچنے اور دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کی اشک شوئی کے لئے جو فسادات تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا اُس نے نہایت غلط طور پر فسادات کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں کے سر ڈال دی۔

# قومی یکجہتی

میں اپنے اس مضمون کی بنیاد علامہ اقبال کے اس مصرعہ پر رکھ رہا ہوں کہ ؎

وابستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

تاکہ کسی مغالطہ کی گنجائش باقی نہ رہے ابتدا ہی سے یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مصرع میں قوم کے افراد سے خطاب کیا گیا ہے۔ اور شجر سے مراد خود قوم ہے یعنی افراد کو بہر صورت اپنے آپ اپنی قوم کو ایک ایسا حصہ تصور کرنا چاہیے جو اپنے کل سے کبھی بھی علیحدہ نہیں ہو سکتا۔

کوئی گروہ یا جماعت کوئی قوم یا ملک اس وقت تک دنیا میں آبرومندانہ زندگی بسر نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کے افراد کے مابین یکجہتی نہ ہو کسی نصب العین کو ایک انسان اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کے سارے اعضا متحد ہو کر اس کے منشا کے مطابق کام نہ کریں۔ اسی طرح قومی ترقی اور فلاح و بہبود اس وقت تک خیال خام سے زیادہ

وقعت نہیں رکھتے جب تک اس قوم کے تمام افراد کے جسم میں ایک ہی روح نہ دوڑ رہی ہو۔ علامہ اقبال مرحوم نے اسی اجتماعی روح کے تصور کو اپنے ذہن میں رکھ کر مسلمانوں سے ایک متحدہ زندگی بسر کرنے کے لئے کہا ہے۔

علامہ مرحوم کا یہ خیال بڑا ہی اعلےٰ و ارفع ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ اجتماعی روح کہتے کسے ہیں؟ یہ کس طرح قوم میں داخل ہوتی ہے؟ اس کا منصب اور مقصد کیا ہوتا ہے؟

یہ اجتماعی روح کوئی ایسی شے نہیں جس کا تعلق صرف مسلمانوں ہی سے ہو۔ اجتماعی روح ہر اس گروہ، جماعت، قوم یا ملک کی رگوں میں دوڑنے لگتی ہے جس کے افراد کے سامنے کوئی نصب العین ہوتا ہے اور وہ اس نصب العین کو حاصل کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ وہ افراد اپنی اپنی جداگانہ ذات کے مالک ہونے کے باوجود اپنے نصب العین کی خاطر متحد الخیال ہو کر سوچتے ہیں۔ اور ان کی یہ سوچ ان میں ایک ذہنی یکجہتی پیدا کر دیتی ہے۔ مگر جب ایسے افراد اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور ان کے سامنے کوئی نصب العین نہیں رہتا تو وہ ریت کے ذروں کی طرح بکھر جاتے ہیں۔ کیا علامہ اقبال نے کسی ایسے اتحاد کی جانب بلایا ہے؟

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ اس مصرعے میں علامہ کا خطاب خصوصیت سے مسلمانوں سے ہے اگر ہم جان لیں کہ مسلمانوں کے متحد الخیال ہونے سے کیا مطلب ہے تو یہ مصرع مزید وضاحت کا طالب نہ رہے گا۔

مسلمانوں کا متحد الخیال اور متحد العمل ہونا ان کے کسی نصب العین کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور مسلمانوں کے نصب العین کا تعین ان کے اپنے ہاتھ میں نہیں۔ بلکہ اس مالک حقیقی کے قبضۂ قدرت میں ہے جس نے مسلمانوں کے نصب العین کا مکمل تعین اپنی کتاب قرآن مجید میں کر دیا ہے۔ مسلمان دنیا کی تقریباً تمام اقوام سے اس لیئے مختلف ہیں کہ ان کے ہاں مادہ اور روح۔ مذہب اور سیاست ایک اصل کی مختلف شاخیں ہیں۔ ایک کا عمل دوسرے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ کسی مسلمان کی زندگی بھی خانوں میں منقسم نہیں ہے۔ مسلمان کا خدا ایک ہے۔ اس کا رسول ایک ہے۔ اس کا قرآن ایک ہے۔ اس کی تنظیم ایک ہے۔ مختصر یہ کہ اس کی زندگی ایک ہے۔ بالفاظِ دیگر ایک مسلمان زندگی کی نمائندگی کرتا ہے۔ ویسی حالت میں مسلمانوں کا نصب العین عارضی نہیں ہو سکتا۔ ان کے نصب العین کے حصول کے مختلف مدارج تو ہو سکتے ہیں مگر کہیں ختم نہیں ہوتا۔ وہ تو بقول علامہ اقبال شرر سے ستارے کی طرف اور ستارے سے آفتاب کی طرف تلاش میں نکلتا ہے سو اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں کی تنظیم جسے اقبال نے شجر سے تعبیر کیا ہے کوئی عارضی شے نہیں۔ بلکہ اس کا تعلق انسانی زندگی کے ساتھ استوار رہتا ہے۔ اور مسلمان کے نزدیک انسانی زندگی اس دارِ فانی میں آنے والی موت سے ختم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ انسان کی پیدائش اور موت اس کی ابتدا و انتہا سے بے نیاز زندگی میں پیش آنے والے واقعات میں سے دو ہیں۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ علامہ ہمیں جس شجر سے وابستہ رکھنا چاہتے ہیں، وہ کوئی زوال پذیر شے نہیں۔ یورپ کے ممالک نے اپنی اپنی قوم کو یکجا کرنے کے لئے ان میں قوم پرستی کی روح داخل کر دی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ

ہر یورپین قوم دوسری قوم کو اپنے سے ذلیل اور کمتر سمجھنے لگی - ہر قوم دوسری قوم کو بڑی مچھلی کی طرح ہڑپ کرنے پر تل گئی - اس متحدہ الخیال افراد کا نتیجہ جنگِ عظیم اول وجنگِ عظیم دوم کی صورت میں دنیا کے سامنے آگیا - ہیروشیما اسی خیال کا نشانہ بنا - یہی جنونی کیفیت اب روس کے ایٹم بم کی صورت اختیار کر کے دنیا کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی دھمکیاں دے رہی ہے - کیا مسلمانوں کا اتحاد بھی اسی قسم کا ہوگا! مسلمانوں کا بطور مسلمان اتحاد بھی اس طرح کا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کے اتحاد کی بنیاد کسی خاص جغرافیائی علاقے یا قوم یا رنگست پر نہیں - بلکہ ان کے اتحاد کے اصول ان کے پروردگار کے وضع کئے ہوئے ہیں - ایک مسلمان کا فعل انسانیت کے اصولوں کے خلاف نہیں ہو سکتا - مسلمان اس لئے متحد الخیال نہیں ہوتے کہ ان کے سامنے کوئی نصب العین رکھ دیا گیا ہے بلکہ ان کے متحد الخیال ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں ایک مضبوط قوم کے طور پر زندہ رہیں - اور جہاں بھی انسانیت کے اصولوں کا خون ہوتا دیکھیں وہیں ان اصولوں کی حفاظت کے لئے پہنچ جائیں - اور ان اصولوں کی خلاف ورزی کرنے والے کو اُسی کے جرم کے مطابق سزا دے کر انسانیت کے سنہرے اصولوں کو سر بلند رہنے کا موقع دیں - یہ کام اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک بطور ایک قوم کے متحد الخیال نہ ہوں -

ہر قوم پر اچھے دن بھی آتے ہیں اور بُرے بھی - جب علامہ نے یہ مصرع کہا تھا اُس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی - وہ انگریز اور ہندو کی دوہری غلامی کا شکار تھے ستم بالائے ستم یہ کہ خود اپنے بھائیوں کی ایک جماعت مسلم دشمن عناصر کا ساتھ دے رہی تھی - سادہ

دل مسلمان پریشان ہو رہے تھے۔ ایسے حالات میں علامہ نے مسلمانوں کو پریشاں خیالی سے نکال کر متحد الخیال زندگی بسر کرنے کو پکارا اور امید دلائی کہ ہماری قوم پر بھلے دن بھی ضرور آئیں گے۔

اس مصرع میں فلسفیانہ نقطہ یہ ہے کہ قومی فلاح سے وہی لوگ مستفید ہو سکتے ہیں جو قوم کی زبوں حالی میں بھی قوم کا ساتھ دیتے ہیں۔ اور اس کی مثال علامہ نے اس شاخ کی سی دی ہے جو عہد خزاں میں بے برگ و بار درخت سے وابستہ رہتی ہے اور اس کے درخت پر بہار رہتی ہے تو یہ شاخ بھی برگ و بار سے مالا مال ہو جاتی ہے کیونکہ یہ اصول ہے کہ خزاں کا جور سہنے والے ہی عہد بہار سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

علامہ کا خیال اپنی جگہ قابلِ صد احترام ہے مگر ہمارا پاکستان میں مشاہدہ اس کے کچھ الٹ ہی ہوا ہے۔ اس حقیقت کو فی الحال کوئی جھٹلانے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ جن لوگوں نے حصول پاکستان میں ناقابلِ بیان تکالیف برداشت کی تھیں ان میں سے غالب اکثریت اپنی عزت بچانے کے لئے گندے کیڑے مکوڑے کی طرح مختلف کونوں میں سر چھپائے آج بھی زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔ مگر جن لوگوں نے حصولِ پاکستان کی راہ میں روز روشن میں ہر ممکن دیوار کھڑی کی تھی وہ آج عزت و دولت کی بلندیوں پر بیٹھے پاکستانی عوام پر نفرت کی نگاہ ڈال رہے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان کی اولاد ان کی وجہ سے پاکستان ہر طرح سے ذلت و رسوائی کا سامنا کر رہا ہے۔

مگر ہمیں ایسے ابن الوقت اور خود غرض لوگوں کی مثال کو اپنے لئے مشعلِ

نہیں بنانا چاہیئے کیونکہ غلط بات ہر صورت غلط ہوتی ہے خواہ اُس بات سے وقتی طور پر کتنا عظیم فائدہ ہی کیوں نہ حاصل ہو۔

ہم مسلمان ہیں۔ دنیا کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی مختلف اقوام ہمارے عالمگیر اصولوں کی بنا پر ہم سے کسی نہ کسی رنگ میں برسرِ پیکار رہتی ہیں۔ بھارت نے ہمارے کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے اور ہمارے عزیز ہمسایہ بھائی افغانستان کو ہمارے ہی خلاف ابھار رہا ہے۔ امریکہ ہماری حقیقی ترقی برداشت نہیں کر سکتا اور ہماری دوستی کا دم بھرنے کے باوجود صرف اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لئے بھارت کو ہر قیمت پر خوش کرنے میں کوشاں ہے حالانکہ اس سے پاکستان کی سالمیت خطرے میں پڑتی ہے۔ ہمارے پرانے سیاسی رہنماؤں میں سے اکّا دکّا چھوڑ کر باقی سب خود غرض اور مفاد پرست ہیں۔ مارشل لاء اٹھ جانے کے بعد یہ لوگ پھر اپنے ہتھیاروں کو تیز کر کے نکل آئے ہیں اور پاکستان کے نام پر اپنی غرضوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے مشرقی پاکستان کے غریب بھائیوں کو پاکستان کے دشمن ایسے راستہ پر چلانے کی کوشش کر رہے ہیں جو ان کے اور ہمارے لئے نقصان دہ ہے ملک کے اندر کمیونسٹ پاکستان کے خلاف تخریبی سرگرمیوں میں مشغول ہیں۔ ہمارے بڑے بڑے افسران صرف اپنے پیٹ کی فکر میں مرے جا رہے ہیں۔ اور اپنے فرائض سے غافل ہیں۔ ہمارے تاجر کوئی ایسا قدم نہ خود اٹھانے کے لئے تیار ہیں نہ حکومت کو اٹھانے دیتے ہیں جس سے ملک ترقی کرے اور عوام کی بہتری ہو۔ یہ تاجر لوگ باہر کے ملکوں کو مال برآمد کرتے وقت نمونے اعلیٰ قسم کے دکھاتے ہیں مگر جو مال برآمد کرتے ہیں وہ نہایت ہی گھٹیا قسم کا ہوتا ہے۔ اس روش سے ہماری ساکھ کو بہت نقصان

پہنچ رہا ہے۔

ایسے پریشان حال میں متحد الخیال اور متحد العمل ہونے کی بے حد ضرورت ہے۔ ہماری ترقی کا زمانہ قریب ہے۔ جو لوگ پاکستان کے موجودہ حالات سے مایوس ہو رہے ہیں انہیں صدر ایوب کی زبان میں کہو "کام، کام اور کام" اور علامہ اقبال مرحوم کے لفظوں میں ع "وابستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ"۔

---

# اچھے کردار کی خصوصیات

انگریزی کی ایک ضرب المثل ہے کہ اگر کسی کی جائیداد تباہ ہو جائے تو اس کا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اگر صحت جاتی رہے تو نقصان قابلِ برداشت ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ کردار کو کھو بیٹھے تو وہ مکمل طور پر برباد ہو جاتا ہے۔ یہ حقیقت اتنی بنیادی ہے کہ آج تک کسی مذہب، ملک، قوم یا گروہ نے اس کی تردید نہیں کی۔ بلکہ ہر ایک نے اچھے کردار کو سراہا ہے۔

کردار کی بنیاد رکھنے کا بہترین اور قدرتی وقت بچپن ہوتا ہے کیونکہ عہدِ جوانی تو سرکشی اور بغاوت کا زمانہ ہوتا ہے۔ بچپن میں انسان کا دماغ صاف سلیٹ کی طرح ہوتا ہے آپ جو چاہیں اس پر لکھ سکتے ہیں۔ بچپن میں حاصل کی ہوئی باتیں زندگی بھر ساتھ رہتی ہیں۔ انسان زندگی کی خواہ کسی منزل میں ہو اور کسی قسم کی زندگی بسر کر رہا ہو اس کے کردار کی بنیادی باتیں وہی رہیں گی جو اس نے بچپن میں سیکھی تھیں۔

میں ایک اچھے کردار کی صفات ذیل میں مختصراً بیان کرتا ہوں - اور ایک اچھے کردار کا مالک وہی آدمی سمجھا جاتا ہے جو ان خصوصیات کو پڑھ کر اپنے علم میں ہی اضافہ نہیں کرتا بلکہ اپنی عملی زندگی میں اِن کا مظاہرہ بھی کرتا ہے اور اچھے کردار کی خصوصیات اِس کی ذات میں متجسم نظر آتی ہیں۔

ایک اچھے کردار کی اولین خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کی ہر بات، اور ہر فعل میں اعتدال ہوتا ہے - وہ کسی بات میں بھی افراط و تفریط کی طرف نہیں جھکتا - وہ ہر کام میں ترازو کا سا توازن اور انصاف پیشِ نظر رکھتا ہے - نیز اس کے چہرے مہرے اور اطوار میں سنجیدگی ہوتی ہے جس سے خود بخود اِس کی ذات میں وقار اور کشش پیدا ہو جاتی ہے اس کی زندگی کا اصول سادگی اور بلند عزائم ہوتا ہے - وہ فوراً نیکی اور بدی میں تمیز کر لیتا ہے - اور تمیز کے ساتھ ساتھ وہ نیکی کو اپناتا اور برائی سے دور رہتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اصل اخلاقی اقدار ہم لوگ ایسے ہی انسانوں سے مل کر اِن کے اعمال و افعال اور گفتار و کردار سے سیکھتے ہیں - زندگی کی بنیاد اخلاقی اقدار پر ہے اور ایک اچھے شہری کے لئے ضروری ہے کہ اس کا اخلاق اور برتاؤ اچھا ہو۔

زندگی میں انسان کو مختلف النوع حالات و واقعات کا سامنا پڑتا ہے - اچھے کردار کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ کسی اچھے یا بُرے واقع سے اپنے احساسات کو متاثر نہیں ہونے دیتا - اُسے نہ کوئی خوشی اپنے لالچ کے دام میں پھنسا سکتی ہے اور نہ غم اُسے مایوسی یا اُداسی کے گڑھے میں پھینک سکتا ہے - وہ حالات سے برسرِ پیکار رہتا ہے - اِن کو اپنے مقصد کے مطابق ڈھالنے میں کوشاں نظر آتا ہے - وہ اِن کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا

اس کی زندگی کا مقصد اسے ہر لحظہ مخالف قوتوں سے ستیزہ کار رکھتا ہے۔ اس کی شخصیت دوسروں کے لئے روشنی کے مینار کی طرح اور ممد و معاون ہوتی ہے۔ اس کی ذات کی مقناطیسی قوت دوسروں کو از خود اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس کے سامنے جو اعلےٰ مقصد ہوتا ہے وہ اس کی تکمیل کی خاطر تن۔ من۔ دھن سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ کوئی لالچ بھی اس کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہیں کر سکتا۔

ایک اچھے کردار کا مالک خواہ کسی مذہب، قوم، ملک، قبیلے سے تعلق رکھتا ہو ہر مذہب، قوم، قبیلے اور گروہ سے پیار کرتا ہے۔ وہ ہر انسان کو صرف انسان سمجھتا ہے۔ وہ کسی انسان سے مذہب، قوم، ملک کے نام سے دشمنی یا عداوت نہیں رکھتا۔ وہ تمام انسانوں کو بطور انسان بھائی بھائی سمجھتا ہے۔ اس کی نظر اور وطیرہ عالمگیر ہوتے ہیں۔ بوقتِ ملاقات وہ ہر ایک سے بڑی حلیمی اور خوش اخلاقی سے پیش آتا ہے۔ مذہبی سیاسی نظریاتی اختلافات ہر جگہ موجود ہوتے ہیں مگر وہ انہیں وجہ مخاصمت نہیں بننے دیتا۔ وہ ہر اختلاف میں فہم و تفہیم سے کام لیتا ہے۔ اپنی رائے دوسروں پر ٹھونسنے کی بجائے وہ اس کی صحت کا ثبوت عملی زندگی سے مہیا کر کے پیش کرتا ہے۔ اس میں اتنی اخلاقی جرأت ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کی صحیح باتوں کو تسلیم کرتا ہے اور جنہیں وہ درست نہیں سمجھتا اُن سے کھلے الفاظ میں انکار کر دیتا ہے۔

جس انسان میں ہمدردی نہ ہو وہ ایک وحشی اور خونخوار بھیڑیے سے بدتر ہے۔ اچھے کردار میں ہمدردی و شفقت اعلےٰ پیمانے پر موجود ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ محبت اور ہمدردی ایسی باتیں ہیں جن پر کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ ہمدردی اور محبت وہی ہے جو انسان کے کردار کا حصّہ ہو۔ ہمارا یہ

فرض اولین ہے کہ غریبوں اور محتاجوں کی بیماری اور بھوک میں مدد کریں۔ ہمیں ایسے مصیبت زدہ بے سہارا مظلوموں اور مسکینوں کا ساتھ دے کر انہیں زندگی میں قابلِ عزت مقام تک پہنچانا چاہیے اور انسان دشمن عناصر کی بیخ کنی کرنی چاہیے۔

خود اعتمادی اچھے کردار کا ایک ستون ہے خود اعتمادی منصفی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اپنوں، غیروں اور خود اپنی ذات سے ہمیں انصاف کرنا چاہیے۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کی بنا پر انسان کا سر خدا کی ذات کے سوا کسی دوسرے کے سامنے نہیں جھکتا۔ یہ جذبہ انسان کی بے پناہ اندرونی طاقت ہے۔

ایک اچھے کردار کا آدمی مہذب اور متمدن ہوتا ہے وہ اچھائی اور نیکی سے پیار کرتا ہے۔ اگر لوگ پیار و محبت کے رشتے کو استوار رکھیں تو ہر قسم کی سماجی برائی کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

---

# نوجوانوں کا فرض

جوانی کیا چیز ہے - یہ کسی عمر رسیدہ آدمی سے پوچھیئے - یا کسی ایسے رہنمائے قوم سے - جو اپنی قوم کو ترقی کی بلندیوں تک پہنچانے کے منصوبے سوچ رہا ہو - جوانی وہ پُرعظمت اور سراپا بہار چیز ہے کہ ہر چھوٹا بڑا جو بھی جنت میں جائے گا - اُسے جوان بنا کر بھیجا جائے گا - گویا یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ خدا تعالےٰ نے بھی اِس عمر کی اہمیت کو واضح کر دیا ہے -

ہر قوم اور ہر ملک اپنے بزرگوں کے تمام احترام کے باوجود اپنی اکثر و بیشتر آرزوؤں کے حصول کے لئے اپنے نوجوانوں کی طرف دیکھتا ہے -

جس طرح ایٹمی توانائی سے ایٹم بم بھی بنائے جاتے ہیں اور اسے انسانوں کے لامحدود فلاح و بہبود کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے - اسی طرح نوجوانوں کی طاقت کو ملک و قوم بلکہ انسانیت کی بہتری کے کاموں میں بھی لگایا جاسکتا ہے اور اسے ملک و قوم اور انسانیت کی تباہی کا باعث بھی

بنایا جا سکتا ہے - اگر ہم ارد گرد اور دنیا میں دیکھیں تو جتنی تجاویز بروئے کار آ رہی ہیں - ان کا زیادہ حصہ بچوں کی دیکھ بھال اور بہتری سے متعلق ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے ہی بہت جلد اور جوان ہو کر ہماری امیدوں کا گہوارہ بننے والے ہیں - اس لئے حکومت اور عوام ہر دو کو شعوری طور پر بچوں کے لئے ایسا ماحول اور خیالات پیدا کرنے ضروری ہیں جس ماحول اور خیالات میں ملک و قوم کی امیدیں جھلکتی ہوں - اگر اُن کے سامنے ماحول تو اخلاق سوز پیش کیا جا رہا ہو اور خیالات کے لئے گھٹیا قسم کی جذباتی فلمیں اور عریانی کے علمبردار رسالے پیش کئے جا رہے ہوں تو کس طرح ان سے با اخلاق، بلند خیالات اور باحیا ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

اگرچہ کہتے ہیں کہ جوانی دیوانی ہوتی ہے - مگر آجکل کی جوانی دیوانی ہی نہیں بلکہ فرزانہ بھی ہے - اس لئے اگر کوئی ادارہ بھی نوجواں کے سامنے غیر صالح چیز پیش کر رہا ہو تو نوجوان اسے بڑی آسانی سے رد کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کی بہتری اسی میں ہے -

دنیا کی ہر عظیم تحریک کو کامیاب بنانے والے نوجوان ہی ہوتے ہیں - یہ انقلاب روس ہو یا انقلاب فرانس - یہ ہندوراج کے لئے انڈین نیشنل کانگریس کی کوشش ہو یا حصول پاکستان کی جدوجہد - ہر جگہ نوجوان ان تحریکوں کو کامیابی سے ہمکنار کرتے نظر آتے ہیں - اس تحریکی اور عظیم حقیقت کو سامنے رکھ کر جب نوجوانوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ اپنی جوانی کے ایّام میں کوئی کارنامہ کر گزرو تو یہ بالکل بجا ہے - جوانی میں انسان کی تمام قوتیں اپنی انتہا پر ہوتی ہے - اگر نوجوان کھیل کے میدان میں جاتا ہے تو اپنی عظمت کا لوہا دنیا سے منواتا ہے - اگر تعلیم کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو حیرت انگیز ترقی

سے صرف اپنے ملکی اساتذہ سے ہی نہیں بلکہ غیر ملکی یونیورسٹیوں سے بھی خراجِ تحسین حاصل کرتا ہے۔ میدان جنگ میں کودتا ہے تو آگ اور خون کے طوفانوں میں سے ہنسی خوشی گزر جاتا ہے۔ غرضیکہ نوجوانی ایک ایسی طاقت کا نام ہے جو ناکام اور مایوسی سے ہمکنار ہونے کے لئے تیار نہیں۔ جب قوموں پر غلامی کی گھٹا چھا رہی ہوتی ہے۔ اس وقت بھی نوجوان ہی آگے بڑھ کر اپنے ملک وقوم کو آزادی کی نعمت سے مالا مال کرتے ہیں۔

ایٹمی توانائی کی طرح نوجوانی کی طاقت کو اکثر غلط استعمال کیا جاتا ہے اور اسے غلط استعمال کرنے والے چند خود غرض لوگ ہوتے ہیں۔ نوجوانوں کا سیاسیات سے آگاہ ہونا نہایت ہی ضروری ہے اور ضرورت پڑنے پر انہیں اپنی رائے کا بھی اظہار کرنا چاہیئے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جو سیاستدان اپنا کام نکالنے کے لئے خود عوام کے سامنے نہیں آنا چاہتے وہ ایسے طالبعلموں کو ڈھونڈھ کر اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں جو حقیقی طالب علم نہیں ہوتے۔ بلکہ وقت کٹی کے لئے یا ایسی سیاسی جماعتوں کے آلہ کار بننے کے لئے طالب علم بنے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ باقی طالب علموں کو جائز یا ناجائز طریقوں سے اپنے ساتھ ملا کر نعرہ بازی کرواتے ہیں۔ طالب علموں کو کسی بھی تحریک کا ساتھ دینے سے پہلے سوچ لینا چاہیئے اور غلط مقصد کا آلہ کار نہیں بننا چاہیئے۔

یہاں اس حقیقت کا بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہر نوجوان اس غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائے کہ وہ انقلاب فرانس کا یا انقلاب روس کا باعث بن سکتا ہے۔ اگرچہ ایسے کام نوجوان ہی کرتے ہیں مگر ایسے کام کرنے والے نوجوانوں میں کچھ صفات بھی ہوتیں ہیں۔ ان کی زندگی کے ہر کام اور ہر بات میں سستی جذباتیت کی بجائے متوازن اور سنجیدگی ہوتی ہے۔ وہ دنیا کے

تغیرات کا مشاہدہ و مطالعہ تو ضرور کرتے ہیں۔ مگر بغیر سوچے سمجھے کسی بات پر عمل کرنے کے لئے تیار نہیں ہو جاتے۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایک خاص قسم کا طرزِ عمل کسی دوسرے ملک میں کامیاب ہوا ہے تو ضروری نہیں کہ وہی طرزِ عمل ان کے ملک کے لئے بھی مفید ثابت ہو۔ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے غیروں کی دریوزہ گری کرنے کے بجائے اپنے دکھ کا علاج خود سوچتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے قول و فعل میں تضاد نہیں ہوتا۔ وہ اپنی اخلاقی اقدار کا مذاق اڑتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ وہ اپنے بدترین دشمن سے بھی شریفانہ برتاؤ کا مظاہرہ کرتے ہیں وقت پڑنے پر رات دن کام کرنے سے انہیں کبھی گریز نہیں ہوتا۔ اگرچہ وہ اپنے ملک یا قوم یا گروہ کے لئے کام کرتے ہیں۔ مگر دوسرے ملکوں یا قوموں یا گروہوں کو نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ یہ نوجوان اپنے مخالفوں پر غصے یا ناراضگی کے بم نہیں برساتے۔ بلکہ انہیں غلط بات پر چلتے دیکھ کر ان پر رحم کھاتے ہیں اور انہیں صحیح راہ پر چلانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ یہ نوجوان ہر انسان کی خواہش کا احترام کرتے ہیں اور ذاتی مفاد اور خواہشات کو دوسروں کے مفاد اور خواہشات پر قربان کر دیتے ہیں۔ انصاف ان کا ہر جگہ رونما ہوتا ہے۔ نوجوان دنیا کے عظیم کارنامے سرانجام دیتا ہے۔ ملکوں اور قوموں کی امیدیں انہیں سے وابستہ ہوتی ہیں۔ مگر اس کے لئے نوجوانوں کو جفاکش

ایثار پرور عالمگیر نکتۂ نظر رکھنے والے آزاد فکر کے حامل، با اخلاق و باحیا، بامقصد، باخبر اور منصف ہونا ضروری ہے۔

# مخلوط تعلیم

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ مخلوط تعلیم یورپ سے آیا ہوا تہذیبِ نو کا ایک خاص تحفہ ہے۔ لیکن تاریخی اعتبار سے مخلوط تعلیم مسلمانوں کے اقتدار میں خصوصاً بغداد کی مسجدوں میں بھی ملتی ہے۔ لیلےٰ مجنوں کے معاشقے کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب کہ وہ دونوں ایک ہی مسجد میں اکٹھے پڑھتے تھے۔ اگر ہم لیلےٰ مجنوں کے قصے کو بے سروپا اور شاعرانہ تخیل بھی مان لیں، پھر بھی اس وقت مخلوط تعلیم ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ کیونکہ ایک شاعر بہر صورت اپنی شاعری کا خام مواد تو اپنے ماحول ہی سے حاصل کرتا ہے۔ لیکن اس مخلوط تعلیم اور موجودہ مخلوط تعلیم میں ایک بہت بڑا اور بنیادی فرق ہے۔ اس وقت لڑکے اور لڑکیاں صرف کم سنی کی عمر میں ہی اکٹھے پڑھتے تھے اور اس کے بعد ایک دوسرے سے جدا کر دیئے جاتے تھے۔ لیکن آج کل نہ صرف سنِ بلوغت بلکہ اس کے بعد تک بھی مخلوط تعلیم

جاری رکھی جاتی ہے

مخلوط تعلیم کے حق میں یہ کہا جاتا ہے کہ تعلیم کا اصل مقصد انسان کی پوری شخصیت کی نشوونما ہوتا ہے اور پوری نشوونما کی تکمیل کے لئے مخلوط تعلیم ایک جزوِ لاینفک ہے۔ کیونکہ مخلوط تعلیم میں لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھتے ہیں اور یہ علم بعد کی زندگی میں بڑا مفید ثابت ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا رائے ایک بنگالی ہندو کی ہے۔ ہمارا مذہب اسلام ہندو تہذیب سے بالکل مختلف ہے۔ ہندو عورت کو پاؤں کی جوتی اور گھر کی داسی (لونڈی) سمجھتے ہیں۔ اور ان کا مذہب انہیں عورت کو ایسا سمجھنے کی مکمل اجازت دیتا ہے۔ اسلام عورت کو مرد کے برابر سمجھتا ہے۔ اسی لئے اس کی ذات کو مرد کی ذات میں گم نہیں کرتا۔ جہاں تک ایک صنف کا دوسری صنف سے کچھ سیکھنے کا تعلق ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ بھرپور اور خطرناک مرحلے میں سے گزرتی ہوئی جوانیوں کو یکجا کر دیا جائے۔ اس طرح گزرنے سے معمولی فائدے کے مقابلے میں عظیم نقصان کا اندیشہ موجود رہتا ہے۔ ہم اس حقیقت کا ایک بار پھر اعتراف کرتے ہیں کہ آئندہ ازدواجی زندگی میں مرد و زن کا ایک دوسرے سے واقف ہونا ضروری ہے۔ لیکن کیا تعلیم یافتہ مرد و زن ایک دوسرے کے متعلق اتنی واقفیت اپنی اپنی تعلیم کے ذریعہ ویسے حاصل نہیں کر سکتے ہے

ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ اگر ہم بھی یورپ اور امریکہ کی طرح اپنی اسلامی اخلاقیات سے آنکھیں بند کر لیں، تو پھر جو چاہیں

کریں۔ ہمیں ہر طرح کا فائدہ ہی فائدہ ہے۔ جس طرح آج امریکہ میں صرف ہائی سکول میں پڑھنے والی لاکھوں لڑکیاں بن بیاہی مائیں بن جاتی ہیں اور ان سے کوئی اخلاقی یا مذہبی یا سیاسی بازپرس نہیں ہوتی۔ اسی طرح ہم بھی ہر طرح کی گرفت ڈھیلی کر دیں۔ مخلوط تعلیم میں چنداں کوئی نقصان نہیں۔ لیکن جب تک ایک پاکستانی مسلمان دوسرے انسان کو صرف اس لئے گولی کا نشانہ بنا دیتا ہے یا اس کے چھرا گھونپ دیتا ہے کہ اس نے اس کی ماں، بہن بیوی یا بیٹی یا کسی رشتہ دار کو بُری نظر سے دیکھا ہے یا مذاق کرنے کی جراُت کی ہے۔ اس وقت تک ہمیں مخلوط تعلیم راس نہیں آسکتی۔ مخلوط تعلیم کے حامیوں کو چاہئے کہ پاکستانیوں کی غیرت کے لہو کو اتنا سرد کر دیں کہ وہ ان نظاروں کو دیکھیں مگر بے تعلقی سے منہ دوسری طرف پھیر لیں۔ اگر ہمارے ملک میں چور بازاری، رشوت وغیرہ اسی طرح رُوبہ ترقی رہے تو بہت جلد پاکستانی نئی تہذیب و ترقی کے نام پر تمام اسلامی، اخلاقی اقدار سے پاک ہو جائیں گے۔ پھر مخلوط تعلیم ہماری ضروریات میں سے ایک چیز بن جائے گی۔

عورت اور مرد کا ایک دوسرے سے ضروریات زندگی کے سلسلے میں ملنا کوئی بُرائی نہیں۔ آج بھی ہمارے دیہاتی مرد و زن کھیتوں میں اکٹھے نظر آتے ہیں مگر یہ اختلاط تعلیم گاہ کے اختلاط سے مختلف ہوتا ہے۔ کھیتوں میں عورتیں اپنے باپ، بھائی، خاوند یا بیٹوں کے ساتھ ہوتی ہیں۔ جنہیں ان کی عزت و آبرو کا ہر طرح سے خیال اور لحاظ ہوتا ہے۔ مگر سکولوں اور کالجوں میں بھانت بھانت کی بولیاں یک جا ہوتی ہیں۔ کوئی ایک کسی دوسرے کی عزت و آبرو کا خیال رکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتا۔

اس حقیقت سے انکار کرنے کی یورپ اور امریکہ کو بھی جراُت نہ ہوگی

کہ عورت کی عصمت و عفت مرد کے مقابلے میں لاکھوں گنا زیادہ لطیف ہوتی ہے۔ کسی عورت کا صرف تنہائی میں ہاتھ ہی پکڑ لینے سے اس کی تذلیل ہو جاتی ہے۔ ایک باحیا عورت کی عصمت اتنی بات پر ہی چیخ اٹھتی ہے اور عورت اپنی نظروں میں خود ہی مجرم بن جاتی ہے۔ اگر مرد کو ایک بار اتنا پتہ چل جائے کہ عورت مرد کے مقابلے میں کتنی لطیف اور حسی ہوتی ہے تو مرد کبھی خواب میں بھی مخلوط تعلیم کے ذریعہ عورت کی تذلیل کی کوشش نہ کرے۔

سکولوں اور کالجوں میں مخلوط تعلیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں! یونیورسٹی تعلیم میں دونوں ایک جگہ اس صورت میں اکٹھے ہو سکتے ہیں کہ ہر دو کی نشستوں کا (جیسا کہ عموماً ہوتا ہے) جداگانہ انتظام ہو اور لڑکیوں کے والدین اس بات کی مکمل احتیاط برتیں کہ اُن کی لڑکیاں ضرورت سے زیادہ وقت یونیورسٹی میں نہ ٹھہریں۔

حقیقتاً مخلوط تعلیم مرد کا سٹنٹ ہے۔ اگر عورت ذات کبھی غور کرے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ اس میں عورت کا ہرگز کوئی فائدہ نہیں۔ صرف مرد نے عورت کے قرب کی خاطر یہ جال پھیلایا ہوا ہے۔ یہاں مرد ماسٹر یا پروفیسر یا ہم جماعت بن کر عورت تک رسائی کا ایک ایسا طریقہ پا لیتا ہے۔ جس پر بظاہر کسی کو بھی اعتراض کی گنجائش نہیں ملتی۔ وہ گوہر جس کے حصول کے لئے سمندروں کی تہوں میں غوطے لگانے درکار تھے آج وہی گوہر اپنی قدر و قیمت سے بے پرواہ ہو کر خود ہی لبِ ساحل آ پڑا ہے۔ اور ہر راہ رو کو دعوتِ نظارہ ہی نہیں دیتا۔ بلکہ اکثر کے پاؤں تلے روندھا بھی جاتا ہے۔ ایک وقت میں عورت کی قدر و منزلت کا یہ عالم تھا کہ بابر جیسا

بادشاہ اپنی بیوی کی پیشوائی کے لئے پیادہ پا جاتا ہے۔ بیوی اپنے خاوند کو دیکھ کر سواری سے اترنا چاہتی ہے۔ مگر بابر بادشاہ اُسے روک دیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ کوسوں اپنی بیوی کی سواری کے ساتھ پیدل چلا جاتا ہے اور آج یہ عالم ہے کہ عورت کی حیثیت دلوں میں ایک خادمہ اور بچے جننے والی مشین سے زیادہ نہیں۔

مخلوط تعلیم کی حمایت میں ایک نعرہ اور بھی لگایا جاتا ہے یعنی عورت مرد کے جنسی تسکین ہی کے لئے نہیں۔ اِس کے اور بھی کئی پہلو ہیں۔ ہم بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر علم و مشاہدات نے یہی ثابت کیا ہے کہ یہ صرف ایک سیاسی نعرہ ہے۔ ورنہ سکولوں کالجوں وغیرہ میں مرد عورت کو ایک جنسی رفیق کے سوا اور کچھ نہیں سمجھتا۔

یہ مخلوط تعلیم کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ہاں مرد نما عورتیں اور عورت نما مرد پیدا ہو جاتے ہیں مردوں میں ایک دوسرے کے لئے رقابت کی وجہ سے دوستی کی بجائے دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے نوجوانوں کی اکثریت ملتی ہے جو اپنے تعلیمی فرائض کی بجاآوری کی بجائے لڑکیوں کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ اور اُس کے ملزوم نتائج کی وجہ سے اپنے فرض... ں ناکام رہ جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں لڑکوں اور لڑکیوں کے جُدا جُدا سکول اور کالج موجود ہیں۔ لڑکے اور لڑکیوں کے لئے مزید سکول اور کالج کافی تعداد میں کھولے جا رہے ہیں۔ اس صورت حال میں خواہ مخواہ مخلوط تعلیم کے ذریعے اپنی قوم کی لڑکیوں کی عصمت و عفت اور لڑکوں کے اخلاق کو ایک خطرناک امتحان میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر ہم حقیقت کے چہرے سے نقاب کشائی کریں

تو شاید اس مہلک حقیقت کا کسی سے بھی جواب نہ بن پڑے کہ لڑکیوں کے سکولوں اور کالجوں کے گرد لڑکوں کا میلہ سا کیا لگا رہتا ہے۔ اور اگر یہی لڑکیاں ان کے پہلو بہ پہلو بیٹھ کر تعلیم حاصل کریں گی، تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔ اس صورت میں فرض کر لیجئے کہ ہر طرح کی نگرانی کی وجہ سے کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آتا۔ لیکن کوئی یہ بتا سکے گا کہ نوجوان لڑکے کسی ذہنی خلفشار اور انتشار کا شکار نہ ہوں گے اور قوم اپنے قومی سرمایہ یعنی آئندہ نسل کی ذہنی اور جسمانی صحت سے محروم نہ ہو جائے گی؟

اب تو مخلوط تعلیم کے حق میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مرد عورتوں سے بہتر استاد ہیں یا مرد عورتوں کے مقابلہ میں زیادہ تعلیم یافتہ ہیں۔ یہ اس وقت کی بات تھی جب کہ ہماری عورتوں نے تعلیم کے میدان میں کوئی ترقی نہ کی تھی۔ اب تقریباً ہر شعبۂ تعلیم میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بہتر استانیاں ملتی ہیں۔ صرف ان کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔

کیونکہ تعلیم کا مطلب آئندہ زندگی کے لئے اپنی نشو و نما حاصل کرنا ہوتا ہے اور عورت کی زندگی کے اکثر مسائل آج بھی نہ صرف مرد سے جدا ہیں بلکہ مرد ان سے واقف بھی نہیں۔ اس لئے ایک لڑکی اپنی مشکلات اور دیگر ذاتی امور کا اظہار جس طرح کھل کر ایک عورت کے سامنے کر سکتی ہے ایک مرد کے سامنے نہیں کر سکتی۔ کیونکہ ہماری موجودہ عورت اپنی تمام ترقیوں کے باوجود مرد سے گفتگو کرتے وقت ایک خاص قسم کے رکھ رکھاؤ سے اسی طرح کام لیتی ہے جس طرح مرد عورت سے گفتگو

کرتے وقت محتاط رہتا ہے ۔ اور ایسے موقعوں پر اکثر لڑکیاں جھینپ سی جاتی ہیں ۔ مخلوط تعلیم ہمارے لئے ایک صحبت ناجنس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ۔

---

# پردہ اور اسلامی معاشرت

تمام تعریف اس خالقِ ارض وسما کو زیبا ہے جس نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر جوہر عقل سے ممتاز فرمایا۔ عقل کی بدولت اس کے دل و دماغ کے صحیح احساسات سے متاثر ہونے کی صلاحیت بخشی۔ اور ان احساسات نے اس کو شرم و حیا کا ثمرہ عطا فرمایا۔ جس سے ہر صاحبِ بصیرت سمجھ سکتا ہے کہ جس انسان میں شرم و حیا نہیں اس میں احساس نہیں۔ جس میں احساس نہیں۔ اس میں عقل نہیں۔ جس میں عقل نہیں وہ انسان نہیں۔ نرا حیوان ہے۔

وہ مالک الملک جس نے ننگی زمین کو لیدِ ثلاثہ کی کائنات سے ڈھک کر۔ برہنہ درختوں کو ہرے ہرے پتوں کا لباس پہنا کر پہاڑوں کو سبزہ اور روئیدگی کی خلعت بخش کر حتیٰ کہ اربعہ عناصر کے ایک کرہ کو دوسرے کرہ پر اور ان پر آسمان کو پردہ پوش بنا کر یہ اشارہ فرما دیا کہ ماہ سے ماہی تک تمام کائنات پر ستر و حجاب کا قانون موثر ہے۔ اس ستارِ عیوب کی قدرت

کاملہ کے ہر فعل میں پردہ کی رعایت مرکوز ہے۔ انسان کو پردۂ عدم سے نکال کر پردۂ رحم میں پرورش دی۔ پھر ایک میعاد متوجل تک اپنی گوناں گوں نعمتوں کے پردہ میں زندگی بخش کر اس کو پردہ خاک میں مستور و محجوب کر دیا۔ حتیٰ کہ روز قیامت میں بھی اس کی ستاری ہی اس کے جرائم و معاصی کی پردہ پوشی ہو گی۔

میرے مضمون کا موضوع بھی پردہ اور اسلامی معاشرت ہے۔ موجودہ دور کے نقطہ نظر سے یہ موضوع اہم ترین موضوع ہے۔ بے شک تمام نفوس و قلوب کا موزوں و متناسب، حسین وجمیل اشیاء کی طرف میلان ایک طبعی امر ہے۔ جو نظام عالم کے خاص اسرار میں سے ہے اسی طرح مرد اور عورت کا میلان بھی ایک طبعی امر ہے۔ جس پر انسانی معاشرت کے مصالح مبنی ہیں۔ کائنات انسانی کی بقا کے لئے رب لعزت نے یہ جو مرد اور عورت کے نام پر دو جنس پیدا کئے ہیں۔ اور ان دونوں میں جذب وکشش کے فطری جذبات ودیعت کئے ہیں۔ ان کا حدِ جواز کے اندر رہنا ہی مستحسن ہے۔ اور اگر یہ جذبہ حد اعتدال سے بڑھ جائے۔ اور اس میں میاں بیوی، غیر مرد اور عورت کا امتیاز نہ رہے۔ تو یہی میلان مضر اور خطرناک، انسانیت اور نسل انسانی کی بربادی کا باعث بن جاتا ہے۔

اس لئے ضرورت ہوئی کہ مردوں اور عورتوں کے اختلاط و مصاحبت اور ملاقات و مکالمت کے متعلق خاص قانون وضع کیا جائے۔ جس کی بدولت شر و مفاسد کا اندیشہ نہ رہے۔ جو مردوں اور عورتوں کے آزادانہ ملاپ میں مقتضیات طبع کے بے قید اور بے روک ٹوک ہو جانے کے باعث ممکن بلکہ یقینی ہے۔ اسلام چونکہ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرنا چاہتا

ہے۔ جو انسانی زندگی کے لئے ہمہ گیر اور جامع نظام حیات پر مشتمل ہو۔
اس سلسلہ میں حضور سرورِ دوعالم ختم المرسلین فخرِ نبی آدم رسول الثقلین نبی الحرمین کو رحمۃ العالمین بنا کر ارحم الراحمین نے انسانی نسلوں کے درمیان لا کھڑا کیا۔ اور خالق کائنات کی طرف "آج سے دین مکمل ہو چکا" کا اعلان کر کے قرآن آخری دستور العمل کی حیثیت سے بنی آدم کے سپرد کیا گیا۔ کوئی شعبۂ زندگی ایسا نہیں جس کے متعلق اس کتاب میں راہنمائی نہ کی گئی ہو۔ پس اسلام نے جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں میں فطرت کی حدود پر انسانیت کو کھینچ کر پہنچایا۔ وہاں مرد اور عورت کے میلان میں بھی اعتدال کا جو فطری وطبعی نقطہ ہو سکتا تھا۔ اس پر چاہا کہ حدود سے ہٹنے والوں کو واپس کیا جائے۔ اس شرعی قانون کے تحت پردے کا حکم ہوا۔

پردہ یا حجاب وہ قرآنی قانون ہے جو ملت اسلامیہ کے طبقۂ ذکور واناث کو حق تعالےٰ جل شانہٗ کی طرف سے اس لیے سپرد کیا گیا کہ اس قانون کے ذریعے وہ اپنی قدرتی عزت اور وقار کی واقعی قدر وقیمت اور ان کی خصوصیات کمالات اور قیمتی جذبات وسعادات کی حفاظت اور تنظیم کر سکیں جو بطور پیدائشی حق کے ان کو اللہ تعالےٰ کی جانب سے ودیعت ہوئے ہیں۔ تاریخ اور زمانہ کی روشنی میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ بے پردگی اختلاط اور باہمی میل جول سے جو شر وفتن پیدا ہوئے ہیں۔ تاریخ اخلاقِ مغرب نے مرد وعورت کے باہمی میل جول اور بے پردگی کے جو نتائج پیش کر دیئے ہیں۔ ان کو سامنے رکھ کر عقلاً بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ پردہ کا شرعی حکم بغیر افراط تفریط سراپا رحمت ہے۔

جنسی میلان جو انسان کی ضمیر میں پیوستہ ہے۔ اس میں کچھ ایسی بربریت

اور درندگی ہے۔ جو معمولی سے بے حجابی کو برداشت نہیں کرتی۔ اور موقع پا کر انسان کو ہلاکت میں ڈالنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس لئے اسلام نے شرم وحیا کے متعلق کچھ ضروری احکام نافذ کئے ہیں۔ شرم وحیا انسان کی ایسی مخصوص صفت ہے۔ جو اُسے لغزش کے موقع پر سہارا دیتی ہے۔ اور اس نیک جذبہ کا یہ اثر ہوتا ہے کہ انسان اپنے جسم کے ان تمام حصوں کو پردہ میں رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جو جنسی میلان میں ہیجانی کیفیت کی وجہ بن سکتے ہیں۔ پردہ اور حیا کا خیال اسی شرم وحیا کا نتیجہ ہے۔

شرم وحیا کی اہمیت جتا کر اسلام ان تمام چیزوں کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ جو بے حیائی کی پیداوار ہیں اور جن کی وجہ سے عفت وعصمت اور اخلاق کا دامن داغدار ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ سے متعلق جو احکام و ہدایات ہیں ان کا اجمالی طور پر تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اس میں بدنظری کو ام الخبائث کی حیثیت حاصل ہے۔ کہ یہ تمام فواحش کی بنیاد ہے۔ اسلام نے اس سوراخ کو پہلے بند کیا اور نظر کو آنکھوں کا زنا قرار دیا۔ نگاہ کی اس تاثیر کے باعث اسلام جب آیا۔ تو اس نے اعلان کیا۔

”اے نبی مومنوں سے فرما دیجیئے کہ اپنی نظریں جھکا لیں“

فتنہ کا چشمہ جہاں سے پھوٹتا ہے۔ اور اخلاق اور معاشرے پر جہاں سے ضرب پڑتی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے ان سوتوں اور سوراخوں کو ہی بند کر ڈالا۔ جائز حد تک اجازت دی۔ اور اس کے بعد پہرہ بٹھا دیا۔ کہ کوئی شخص قصداً ایسا کوئی کام نہ کرے جو برائی کا زینہ بن جائے۔ نگاہ جس کو سلف صالحین نے برید العشق (عشق کا پیغام بر) سے تعبیر کیا۔ اسلام نے اس پر

قانون کی مہر لگا دی - اس کے نتیجے اور فائدے کو بتایا کہ اس سے شہوت کی جگہوں کی حفاظت ہوگی - نیز یہ تزکیہ قلوب میں بھی معاون ہوگی - اوپر کی آیت میں جس چیز کا حکم دیا گیا ہے - وہ ایک مسلمان کے لئے لازمی ہے - نگاہ نیچی رکھنا یا نگاہوں کا بچانا فطرت اور حکمت الٰہی کے تقاضوں کے مطابق ہے - اس لئے کہ عورتوں کی محبت اور دل میں ان کی طرف خواہش فطرت، کا تقاضا ہے - سورہ آل عمران میں ارشاد ربانی ہے -

"مرغوب چیزوں کی محبت پر لوگ فریفتہ کئے گئے ہیں جیسے عورتوں پر"

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے - کہ آنکھوں کے فتنے سے یقینی طور پر اپنے آپ کو بچاؤ کیونکہ یہ تمام تر فتنہ آفت کا بنیادی سبب ہے -

صاحب منہاج العابدین صفحہ ۲۸، ۲۹ پر لکھتے ہیں کہ آیت "اے نبی مومنوں سے فرما دیجئے کہ اپنی نظریں جھکا لیا کریں" میں رب العزت نے تین چیزیں بیان کی ہیں - تادیب و تنبیہ و تہدید، آیت کا ابتدائی حصہ تادیب ہے - کہ بندہ اپنے آقا کی اس بات میں فرمانبرداری کرے - یعنی کسی کو اگر دیکھنا ناجائز ہو تو دیکھنے کی جرأت نہ کرے - اور دوسرے حصہ میں تنبیہ کہ اس غض بصر کا فائدہ یہ ہوگا کہ قلب میں پاکیزگی آئے گی - اور اگر اس ہدایت پر عمل نہ ہوگا - تو آنکھوں کے ذریعے کسی نہ کسی فتنے میں پڑنے کا قوی اندیشہ ہے - جس کا نقصان یہ ہوگا کہ سکون قلب جاتا رہے گا - اور دل وسوسوں کی آماجگاہ بن جائے گا - اور آیت کے اخیر حصے میں تہدید ہے کہ اگر بندوں نے اس ہدایت کی پرواہ نہ کی تو یہ سمجھ رکھیں کہ رب العزت غافل نہیں وہ ساری کارروائیوں سے واقف ہے -

اگر اسلام نے صراحتاً مردوں کو عفت کی تعلیم دی - تو عورتوں کو

فراموش نہیں کیا کیونکہ مرد اور عورت دونوں کا ضمیر ایک ہی ہے۔ کم و بیش کا فرق ہے۔ عورت کی فطرت بھی شہوت اور اس کے دعاوی سے خالی نہیں۔ اس لئے رب العالمین نے سورہ نور کے چوتھے رکوع میں فرمایا۔

"اور اے نبی فرما دیجئے مومن عورتوں سے کہ اپنی نگاہیں جھکائیں"

اس آیت اور قرآن پاک کی دوسری آیتوں کو سامنے رکھ کر علمائے کرام کی ایک بڑی جماعت کہتی ہے کہ عورت کے لئے جائز نہیں کہ یہ کسی اجنبی مرد کو دیکھے۔ اس کا یہ دیکھنا شہوت سے ہو یا بغیر شہوت دونوں ہی صورتوں میں ناجائز ہے۔ حدیث سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت ام سلمہ رضؓ کہتی ہیں کہ میں اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا آنحضرت کی خدمت میں تھیں۔ ابن ام مکتوم رضؓ نابینا صحابی کسی ضرورت سے خدمت نبوی میں حاضر ہوئے۔ ابن ام مکتوم رضؓ کو دیکھ کر آنحضرت نے فرمایا۔ تم دونوں پردہ میں چلی جاؤ۔ ام سلمیٰ رضؓ کہتی ہیں کہ میں نے رحمتِ عالم سے کہا۔ یا رسول اللہ کیوں یہ نابینا نہیں ہیں۔ مشکوۃ صفحہ ۲۶۹ عن ابوداؤد میں لکھا ہے کہ آپ نے فرمایا کیا تم دونوں بھی اندھی ہو، ان کو نہیں دیکھتی ہو۔ یہ واقعہ نزول حجاب کے بعد کا ہے۔ اس حدیث سے عورتوں کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح مردوں کے دل میں عورتوں کو دیکھنے سے تحریک پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح مردوں کو دیکھنے سے عورتوں کے جذبات میں تحریک پیدا ہو سکتی ہے۔

حافظ ابن القیم "الجواب الکافی" میں تحریر فرماتے ہیں "نگاہ شہوت کی قاصد اور پیغامبر ہوتی ہے۔ اور نگاہ کی حفاظت دراصل شرمگاہ اور شہوت کی جگہ کی حفاظت ہے۔ جس نے نظر کو آزاد کر دیا۔ اس نے اس کو ہلاکت میں ڈال دیا۔ اور نظر ہی ان تمام آفتوں کی بنیاد ہے۔ جن

میں انسان مبتلا ہوتا ہے۔ کیونکہ نظر کھٹک پیدا کرتی ہے۔ پھر کھٹک فکر کو وجود بخشتی ہے۔ اور فکر شہوت کو ابھارتی ہے۔ شہوت ارادہ کو جنم دیتی ہے۔ ارادہ قوی ہو کر عزیمت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور عزیمت بھی مزید پختگی ہو کر فعل واقع ہوتا ہے۔ جس سے اس منزل پر پہنچ کر کوئی چارہ نہیں رہتا۔ جب کوئی مانع حائل نہ ہو۔" یہی وجہ ہے کہ رحمت العالمین نے غض بصر کی تاکید فرمائی۔

مسند احمد میں ایک روایت ہے "کہ نبی صلعم نے فرمایا کہ کوئی مسلمان جب پہلی مرتبہ کسی عورت کی خوبصورتی دیکھے، پھر اپنی نگاہ پست کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اس کی عبادت میں شیرینی پیدا کر دیتا ہے"۔ نگاہ پست کرنا جھکانا مختلف طور پر ہوتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ کسی طرح اپنے آپ کو اس فتنہ سے بچایا جائے جو سامنے ہے۔ نظر پھیر لی جائے۔ نیچی کر لی جائے۔ یا اور کسی چیز پر نگاہ جما دی جائے۔ تاکہ نظر اُس فتنہ سے محفوظ رہے۔

ثانیاً قرآن کا مطالبہ ہے کہ اگر ضرورت کی وجہ سے ان کو گھر سے باہر نکلنا پڑے "تو اے نبی آپ اپنی بیویوں سے بیٹیوں سے اور مومنوں کی عورتوں سے فرما دیجیئے کہ اوڑھنے کی چادر اپنے اوپر جھکا لیا کریں۔ (یعنی چہروں پر) مولانا اشرف علی تھانوی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ کہ بلا ضرورت اور خوف فتنہ کے وقت چہرہ چھپانا واجب ہے۔ اور اپنی تائید میں "درمختار" کی یہ عبارت لکھتے ہیں۔

جوان عورت کو مردوں میں چہرہ کھولنے سے منع کیا جائے۔ یہ اس لئے نہیں کہ چہرہ برہنگی ہے بلکہ اس لئے کہ فتنہ کا خوف ہے۔

ثانیاً ارشاد ہوتا ہے۔ باہر نکلیں یا کسی کے سامنے آئیں تو چادر (دوپٹہ)

اوپر سے ڈال لیں اور بدن کا تراش ظاہر نہ ہونے دیں - پھر دوسری جگہ سورہ نور کے چوتھے رکوع میں اعلان کیا "اور اپنے دوپٹے اپنے گریبانوں پر ڈال لیں - اس آیت میں دوپٹہ یا چادر کے لیے خُمُر کا لفظ استعمال ہوا ہے جو کہ خِمار کی جمع ہے - عربی زبان کی لغت میں خِمار اس ڈوپٹے کو کہتے ہیں - جس کو عورت اپنے سر پر ڈالتی ہے - سلف صالحین نے بیان کیا ہے کہ سر پر سے لاکر سینوں پر اس طرح ڈالا جائے کہ جسم کے ابھار اور مواضع زینت میں سے کوئی حصہ نظر نہ پڑے - اس طرح ہرگز نہ ہو - کہ ڈوپٹہ کا آنچل پیچھے کی طرف ڈال لیا جائے - جس سے سینہ کا ابھار نہ چھپ سکے بلکہ اس میں اور ابھار پیدا ہو جائے - جیسا کہ جاہلیت کے دور میں رواج تھا -

اب تک قرآن پاک اور احادیث اور عقل انسانی کی روشنی میں بحث کی گئی - مگر کچھ لوگوں کو اس وقت تک تسکین نہیں ہوتی - جب تک وہ اہل یورپ کی رائے ملاحظہ نہیں کر لیتے - چنانچہ ایسے روشن خیال طبقہ کے لئے انیسویں صدی کے انسائیکلوپیڈیا کے حوالے سے پردہ کی تائید نقل کرتا ہوں - انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے "رومن ایمپائیر جو تمام یوروپ کی ماں ہے اور جو حکومت تمدن و تہذیب کے اعلےٰ درجہ پر فائز تھی یہاں رومن ایمپائیر میں بھی عروج و ترقی کے زمانہ میں عورتیں پردہ ہی میں رکھی جاتی تھیں -

عورتوں کے متعلق حجاب کا جو خداوندی قانون ہے - تجربات کی روشنی میں اہل یورپ کے بڑے بڑے علماء نے بھی اس کے آگے سر تسلیم خم کر لیا ہے - چنانچہ فلسفہ حسیّ کا موسس اگسٹ کونٹ اپنی مشہور تصنیف "النظام السیاسیہ علیٰ حسب الفلسفۃ الحسیہ" میں صفحہ ۶۴ اور ۶۵ پر لکھتا ہے "جس طرح ہمارے زمانہ میں عورتوں کی سوشل حالت کے متعلق خیالی گمراہیاں پیدا ہو رہی ہیں اسی

طرح تغیر نظام تمدن اور آداب معاشرت کے ہر ایک دور میں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ مگر وہ قانونِ قدرت جو جنس عورت کو منزلی زندگی کے لئے مخصوص رکھتا ہے۔ اس میں کبھی کوئی اہم تغیر نہیں ہوا۔ یہ قانونِ الٰہی اس درجہ صحیح اور محقق ہے کہ گو اس کی مخالفت میں سینکڑوں باطل خیالات قائم ہوتے رہے مگر یہ بغیر کسی نقصان یا تغیر کے سب پر غالب آتا رہا۔ مردوں کے مشاغل میں عورتوں کی شرکت سے جو خوفناک نتائج اور فساد پیدا ہو رہے ہیں۔ ان کا علاج یہی ہے کہ دنیا میں جنس مرد پر جنس عورت کے جو مادی فرائض ہیں۔ ان کی حد بندی کر دی جائے۔ مرد پر واجب ہے کہ عورت کے تغذیہ کا انتظام کرے۔ یہی وہ قانون طبعی اور ناموس الٰہی ہے۔ جو جنس عورت کی اصلی زندگی کو منزلی دائرہ میں محدود کرتا ہے۔ یہی وہ قاعدہ ہے جو ہیئت اجتماعی کے خوفناک اور مہیب اشکال کو احسن واکمل کر دیتا ہے۔ یہی وہ قانون ہے جو عورت کو اپنے طبعی جذبات سے ترقی نوع انسانی جیسے شریف فرض کی بجا آوری پر آمادہ کرے۔

آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ اسلام نے عورتوں کے لئے جو قانون اول دن سے مرتب کیا تھا آج دنیا پھر پھرا کر اسی طرف آرہی ہے۔ پردہ دراصل عورت کی نسوانیت، عصمت وعفت کا وہ گوہر گرانمایہ ہے۔ جس سے انسانیت کے تاج کی زیب وزینت ہے۔ اور اس کی بے قدری سے انسانیت پامال ہوتی ہے۔ جس کی پابندی عصمت کے تحفظ کی ضامن ہے۔

لیکن آج کل خاص طور پر اس ترقی کے دور میں پردہ ایک پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہے۔ بعض اس کے حامی ہیں اور بعض مخالف۔ موجودہ زمانہ کا پردہ برائے نام کا ہے۔ حقیقی پردہ فیشن ایبل برقعوں میں ملبوس ہو جانا نہیں ہے۔ بلکہ اس

سے بڑھ کر ہمیں اپنے دل ونگاہ کو پردے میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ دراصل پردہ بھی یہی ہے۔ جب آنکھ اور دل بری نظر اور گندے خیالات سے ناپاک ہوں تو ظاہری پردہ بے معنی ہے۔ ایسا پردہ شرم وحیا کی توہین ہے۔ یعنی حیاء اور عفت، پاکدامنی، عورت جب اس برقع کو زیب تن کئے ہوتی ہے۔ تو وہ نہ دوسروں کی نگاہوں کے تیر کا نشانہ بنتی ہے۔ اور نہ خود اپنی نگاہوں سے دوسروں کو نشانہ بناتی ہے۔

افسوس آج کے معاشرے میں جو مغربی تہذیب وتمدن ومعاشرت کی فتنہ بار گھٹا چھا رہی ہے۔ مغرب کی تقلید میں آج جو مسلمانوں نے عورت کو خلاف فطرت آزادی دے رکھی ہے۔ اس کے لئے بلا نقاب وحجاب باہر چلنا۔ تنہا سیر وتفریح کرنا۔ غیر مردوں سے تخلیہ واختلاط، اس نے اسلامی معاشرے اور اس کی تہذیب وتمدن میں شر وفساد کے عناصر کو جنم دے دیا ہے۔ چنانچہ آج جن معزز گھرانوں کی عورتیں کبھی گھر کی دہلیز پر قدم رکھنا بھی شیوۂ حیاء کے خلاف سمجھتی تھیں۔ جس حریم ناموس میں ایک پانچ سالہ لڑکے کی باریابی غیرت کے منافی سمجھی جاتی تھی۔ آج ان کی نوجوان لڑکیاں۔ بیٹیاں مغربی فیشن کے مطابق اپنے کاکل وگیسو کی قطع برید کرا کے مغربی تنگ وچست لباس زیب تن کر کے سرعام مردوں کو دعوت گناہ دیتی پھر رہی ہیں۔ پردہ دراصل عورت کی نسوانیت ہے لیکن آج وہ نسوانیت مرچکی ہے۔ اس نے بے حیائی کا روپ دھار لیا ہے۔ ملت اسلامیہ کی شرم وحیا کا جنازہ اٹھنے کو اور مغرب کی سرحد میں دفن ہونے کو ہے۔ لباس ترقی کر کے عریانی میں تبدیل ہو رہا ہے۔ خدا ملت اسلامیہ کو اس بے حیائی کے فتنہ سے بچا لے۔

اے بلا پردہ شیرب بخواب    خیز کہ شد مشرق ومغرب خراب